غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح

(نکاح کی حقیقت اور فوائد)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	قرآن وحدیث میں غیر ضروری امور مذکور نہیں	۸
۳	تفسیر بالرائے کی حقیقت	۸
۴	کثرتِ رائے کی حقیقت	۹
۵	کثرتِ رائے کے فیصلے میں خرابی	۱۰
۶	وحی کا اتباع ضروری ہے	۱۱
۷	شبہات کا علاج	۱۱
۸	نورِ محبت کا فائدہ	۱۲
۹	علماء کو نصیحت	۱۳
۱۰	ناواقف فن سے علاج کروانے کا نقصان	۱۴
۱۱	بغیر استاد ترجمہ قرآن پڑھنا درست نہیں	۱۵
۱۲	تقلید کی اہمیت وضرورت	۱۵
۱۳	صرف ترجمہ پڑھ کر قرآن کا مطلب بیان کرنے کی حقیقت	۱۶
۱۴	علما کی ذمہ داری	۱۷
۱۵	مل کر کام کرنے کا مطلب	۱۹
۱۶	کسی تحقیق کو قرآن سے ثابت کرنا درست نہیں	۱۹

۱۷	عوام کا ترجمہ سے استدلال کی حقیقت	۲۱
۱۸	جاہلانہ استدلال کا الزامی جواب	۲۲
۱۹	مضامین قرآن میں رائے زنی سے احتراز کریں	۲۳
۲۰	اپنے ایمان کی قدر کرو	۲۴
۲۱	علم دین کے مقابلے میں علم دنیا جہل ہے	۲۵
۲۲	آج کل کا معیار قابلیت	۲۵
۲۳	اعتراض کا شافی جواب	۲۶
۲۴	علوم جدیدہ کے حاملین اور علماء دین میں فرق	۲۸
۲۵	ترجمہ وتفسیر آیت	۲۹
۲۶	نکاح کے بعد میاں بیوی میں محبت ہونا دلائل قدرت میں سے ہے	۲۹
۲۷	مودت اور رحمت میں فرق	۲۹
۲۸	معاملہ نکاح میں دلائل قدرت الٰہی	۳۱
۲۹	وجود باری تعالیٰ پر استدلال	۳۱
۳۰	مصنوعات کے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے	۳۲
۳۱	عہد ﴿اَلَسْتُ﴾ پر شبہ کا جواب	۳۲
۳۲	ازل میں جو عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کہا گیا تھا اس کی کیفیت اور اثرات	۳۳
۳۳	وجود صانع کی فلسفی دلیل	۳۵
۳۴	فلاسفہ کے اشکال کا جواب	۳۶
۳۵	فلاسفہ کا دوسرا شبہ اور اسکا جواب	۳۷
۳۶	بعض دلائل کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں	۳۷
۳۷	جواب سمجھنے کے لئے اہلیت شرط ہے	۳۸

۳۸	مرد وعورت کے نکاح میں آیات کثیرہ کا وجود	۳۹
۳۹	مسئلہ تجدد امثال	۴۰
۴۰	تشبہ سے مقصود	۴۱
۴۱	صوفیاء کی تفاسیر کی حقیقت	۴۱
۴۲	ملحدین کے قول کی تردید	۴۲
۴۳	مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا صحیح مطلب	۴۲
۴۴	روح عمل کا تحقق بدون ظاہر کے نہیں ہوسکتا' اس کی مثال	۴۳
۴۵	صوفیاء کی تفاسیر کا مقصود	۴۴
۴۶	علم استدلال اور علم اعتبار کی تحقیق	۴۵
۴۷	صوفیاء کے علم اعتبار کے استعمال کے شواہد	۴۶
۴۸	شبہ کا جواب	۴۸
۴۹	مشبہ بہ کا افضل ہونا ضروری نہیں اوضح ہونا ضروری ہے	۴۹
۵۰	چاند اور سورج کے نور سے کیوں تشبیہ نہیں دی	۴۹
۵۱	چراغ کے نور اور چاند سورج کے نور میں فرق	۵۰
۵۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درود کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ	۵۱
۵۳	علم اعتبار کے استعمال کا حدیث سے ثبوت	۵۱
۵۴	مسئلہ تقدیر کی وضاحت	۵۲
۵۵	باتوں سے کام نہ چلے گا عمل سے کام چلے گا	۵۳
۵۶	موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا عجیب مکالمہ	۵۳
۵۷	شبہات کا علاج اور اسکا طریقہ	۵۴

۵۸	کام کی چیز	۵۶
۵۹	معرفت نفس وسیلہ ہے معرفت رب کا	۵۷
۶۰	شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال	۵۷
۶۱	ابن عباس رضی اللہ عنہما سے علم اعتبار کا استعمال	۵۸
۶۲	علم اعتبار کی حقیقت کی توضیح	۶۰
۶۳	اخذِ مضمون بطور علم اعتبار	۶۱
۶۴	معاملہ نکاح تعلق مع اللہ کی نظیر ہے	۶۱
۶۵	شبہ کا جواب	۶۲
۶۶	وصول کے معنی اور تعلق مع اللہ کے درجات	۶۳
۶۷	سیر فی اللہ کے غیر محدود ہونے کی مثال	۶۳
۶۸	معاملہ نکاح سے حاصل شدہ سبق	۶۴
۶۹	سالک کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ بھی اس کو چاہتے ہیں اور اس کی دلیل	۶۵
۷۰	تعلق مع اللہ اور نکاح میں ایک اور مشابہت	۶۷
۷۱	لڑکی پر نکاح کا اثر تعلق مع اللہ میں اس سے سبق نہیں چاہئے	۶۸
۷۲	تعلق مع اللہ کی ایک اور نظیر	۶۹
۷۳	مرد بیوی کی باتوں کا بہت تحمل کرتا ہے اس سے بھی سبق لینا چاہئے	۶۹
۷۴	حکایت	۷۰
۷۵	خلاصہ وعظ	۷۱
۷۶	نکاح کا تکوینی راز	۷۱
۷۷	انتخاب مضمون کی وجہ	۷۲
۷۸	خاتمہ اور دُعا	۷۲

وعظ

غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح

(نکاح کی حقیقت اور فوائد)

یہ وعظ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے ڈپٹی علی سجاد صاحب کی دو بیٹیوں کی شادی کے موقع پر ڈپٹی صاحب کے اعزہ کی درخواست پر تھانہ بھون میں اپنی چھوٹی اہلیہ کے گھر پر ۲۳/ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ بروز شنبہ ۳ گھنٹے تک ارشاد فرمایا

اس بات کو واضح طور پر بیان کیا کہ نکاح کا معاملہ بالکل سلوک کے مشابہ ہے جو درجات واحوال اس تعلق نکاح کے ہیں وہی تعلق مع اللہ کے ہیں۔

پس ہم کو اس سے سلوک باطن اور تعلق مع اللہ کا سبق سیکھنا چاہئیے۔

یہ وعظ ہر طبقہ کو مفید ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو قلم بند فرمایا سامعین میں پچاس کے قریب مرد حضرات اور خواتین پردے میں اس کے علاوہ تھیں۔

اس وعظ میں جدید اشکالات کا بہت احسن طریقہ پر جواب دیا گیا ہے۔ قارئین کو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔

خلیل احمد تھانوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتو کل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرّجیم

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

﴿وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ﴾ (۱)

تمہید

ان آیات کی تلاوت سے غالبًا ان لوگوں کو جو ترجمہ سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں یہ شبہ ہوا ہوگا کہ شاید میں نکاح کے حقوق بیان کروں گا کیونکہ موقع بھی نکاح کا ہے اور درخواست کرنے والے بھی اسی تقریب میں آئے ہیں مگر اس وقت میرا یہ مقصود نہیں نہ اس واسطے کہ یہ مضمون مقصود بالذات نہیں کیونکہ اگر یہ مضمون (یعنی حقوقِ نکاح کا بیان) فی نفسہ مقصود نہ ہوتا تو نصوص (۲) میں اس کا ذکر نہ ہوتا کیونکہ نصوص میں غیر ضروری امور کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اس وقت مجھے دوسرا مضمون بیان کرنا ہے جو نیا مضمون ہے، جو غالبا آج سے پہلے کانوں میں نہ پڑا ہوگا اور

(۱) سورۂ روم: ۲۱ (۲) قرآن وحدیث میں۔

حقوق نکاح کا بیان بعض مواعظ میں چند بار بیان ہو چکا ہے اور فقہ کے اردو رسائل میں بھی انکا ذکر ہے اس لئے اس وقت میں ان حقوق کو بیان نہ کرونگا۔

قرآن وحدیث میں غیر ضروری امور مذکور نہیں

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نصوص میں غیر ضروری امور کا ذکر نہیں کیا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جو لوگ قرآن وحدیث میں غیر ضروری امور کو داخل کرتے ہیں وہ غلطی کرتے اور نصوص کی وقعت کو کم کرتے ہیں کیونکہ اس کی ایک مثال ہے جیسے کوئی طب اکبر(۱) میں جوتا سینے کی ترکیب داخل کردے اور ربط یہ بیان کرے کہ بعض امراض ننگے پاؤں پھرنے سے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا علاج جوتا پہننے ہی سے ہوسکتا ہے اس لئے ہم نے ناظرین کی آسانی کے لئے جوتا سینے کی ترکیب بھی لکھ دی ہے مگر یقیناً اس ربط کے بعد بھی یہ مضمون اس کتاب کی وقعت کو کم کردیگا (کیونکہ یہ ربط محض لغو ہے اگر اس وجہ سے طب اکبر میں جوتا سینے کی ترکیب اضافہ کی جائیگی تو پھر کپڑا بننے کی ترکیب بھی بڑھانا چاہئے کیونکہ بعض امراض عریانی سے پیدا ہوتے ہیں اور کھانا پکانے کی ترکیب بھی لکھنا چاہیے کیونکہ بعض امراض بھوکا رہنے یا خراب غذا کھانے سے پیدا ہوتے ہیں اور پاخانہ کمانے کی ترکیب بھی درج کرنا چاہئے کیونکہ بعض امراض غلاظت اور ترکِ صفائی سے پیدا ہوتے ہیں پھر وہ طب کی کتاب کیا ہوئی قیامت کی معجون مرکب ہوگئی ۱۲ظ)۔

تفسیر بالرائے کی حقیقت

اسی طرح تفسیر بالرائے کرکے قرآن میں غیر ضروری امور اور فضول تحقیقات کو ٹھونسنا بھی قرآن کی وقعت کو کم کرنا ہے یہ سخت غلطی ہے جس کا منشا خود رائی

(۱) طب یونانی کی ایک مشہور کتاب ہے۔

ہے جس سے وہ تفسیر پیدا ہوئی ہے مگر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کی رائے کی صحت پر ہی کیا اطمینان ہے کیونکہ خود آراء میں بکثرت اختلاف ہے اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ کونسی رائے صحیح ہے۔

کثرتِ رائے کی حقیقت

اب میں قطع نظر تفسیر بالرائے سے مطلق کثرتِ رائے کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں آج کل اکثر امور میں اس کے لئے ایک قاعدہ نکلا ہے کہ کثرت کی طرف فیصلہ کیا جائے۔

مگر اس میں اول تو یہ کلام ہے کہ جس کو آپ کثرت سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں کثرت نہیں کیونکہ تم نے دس پندرہ یا بیس پچاس آدمیوں کو جمع کر کے ان سے رائے لے لی اور کثرت پر فیصلہ کر دیا حالانکہ کڑوروں آدمی ابھی ایسے باقی ہیں جن سے رائے نہیں لی گئی کیونکہ عوام سے کون رائے لیتا ہے اور ان کی رائے شمار ہی کون کرتا ہے اگر عام سے رائے لی جائے اور ان کی آراء کو شمار کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ جس کو آپ کثرت سمجھتے تھے حقیقت میں وہ قلت (۱) ہے اور اگر یوں کہو کہ ہم کو عوام سے رائے لینے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم عقلاء کا انتخاب کرینگے اور ان کی کثرت پر فیصلہ کا مدار رکھیں گے تو میں پوچھوں گا کہ عقلاء کس معیار سے منتخب کیے جائیں گے اور اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل؟ اگر انتخاب کا معیار تم نے اپنی ذاتی رائے سے قائم کیا تو تمہاری رائے کے غلط نہ ہونے کی کیا وجہ؟ اور اگر کثرتِ رائے سے وہ معیار اختیار کیا تو ہمارے خیال میں تو آج تک کسی نے اس معیار کے متعلق کثرتِ رائے حاصل نہیں کی۔ اور جس دن اس مسئلہ کو کثرتِ رائے سے حل کیا

(۱) جس کو آپ اکثریت سمجھ رہے تھے وہ تو اقلیت ہے۔

جائے گا ہم دکھلا دیں گے کہ یہ مسئلہ طے ہی نہ ہوگا (کیونکہ ہر شخص انتخابِ عقلاء کا معیار ایسا بیان کریگا جس میں وہ خود بھی داخل ہوسکے ایسا معیار کوئی نہ بیان کریگا جس کی وجہ سے وہ خود بیوقوف قرار پائے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی ایک معیار پر کثرت رائے ہوجانا دشوار ہے۱۲ظ) غالباً آج آپ کو کثرتِ رائے پر فیصلہ کرنے کی حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ یہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت میں فیصلہ ہمیشہ شخصی رائے سے ہوتا ہے کیونکہ کثرتِ رائے کے حاصل کرنے کا جو معیار تجویز کیا جاتا ہے وہ شخصی رائے سے تجویز ہوتا ہے اس میں خوب غور کرو یقیناً انتہا شخصی رائے پر ہوگی۔

کثرتِ رائے کے فیصلے میں خرابی

پھر ہم کہتے ہیں کہ اس کثرتِ رائے کے فیصلے میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائے میں بیان کی جاتی ہے کیونکہ کثرتِ رائے کے فیصلے سے بھی رعایا کی حریت باطل (۱) ہوجاتی ہے جس کا آج کل بہت چرچا ہے کہ مساوات اور حریت ہونی چاہیئے یہاں تک کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ تم عورتوں کو تو مردوں کے برابر پیچھے کرنا پہلے مردوں مردوں کو تو برابر کردو میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا پارلیمنٹ کے سب قوانین عام رعایا کی رائے کے موافق ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں افراد کی رائے کے خلاف ہوتے ہیں تو کیا اس صورت میں کثرتِ رائے سے حریت باطل نہیں ہوئی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو جن کی رائے پارلیمنٹ کے فیصلے کے خلاف ہے اس فیصلہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اُن پر جرم کی دفعات قائم کرتے ہیں آخر ان کو آزادی کیوں نہیں دی جاتی' یہ کیا کہ مرد وعورت تو برابر ہوں اور مرد مرد برابر نہ ہوں'

(۱) عوام کی آزادی سلب ہوتی ہے

کیا یہ ظلم وستم نہیں؟ اور جب کثرتِ رائے سے بھی حریت کا ابطال(۱) ہوتا ہے اور وہی جبرو استبداد(۲) اس میں بھی جو شخصی رائے میں ہے تو اب بتلایئے کہ ایک شخص کی غلامی اور استبداد سے پارلیمنٹ کی غلامی اور اس کا استبداد کیوں افضل ہے؟ یقیناً بیس پچاس آدمیوں کی غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی۔

وحی کا اتباع ضروری ہے

جیسا ایک عاقل سلیم الفطرۃ شاعر کہتا ہے ؎

اَرَبًّا وَّاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ　　اَدِیْنُ اِذَا تُقُسِّمَتِ الْاُمُوْرُ
تَرَکْتُ اللَّاتَ وَالْعُزیٰ جَمِیْعًا　　کَذَالِکَ یَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِیْرُ (۳)

پس اپنی اپنی رائے کا یا کثرتِ رائے کا اتباع نہ کرو بلکہ حکمِ واحد کا اتباع کرو اور وہ حکم واحد وحی ہے اس میں خود رائی سے فضولیات کو نہ ٹھونسو کیونکہ رائے کی صحت پر کسی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا جیسا کہ اوپر مفصل معلوم ہو چکا پس اپنی رائے کو رہنے دو اور جو کچھ وحی بتلائے اس کا اتباع کرو۔ جو شخص وحی میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے وہ جاہل ہے مجنون ہے مگر آج کل بڑی حمایت یہ ہو رہی ہے کہ مجنون اپنے کو مجنون نہیں سمجھتا اور یہ بھی آثار جنون سے ہے (بلکہ جنون کا اعلیٰ نمبر ہے ۱۲ ظ)۔

شبہات کا علاج

اور اگر کوئی یہ کہے کہ میں نصوص کی تفسیر اپنی رائے سے اس لئے کرتا ہوں کہ نصوص کی مشہور تفسیر میں شبہات پیدا ہوتے ہیں تو میں کہوں گا کہ شبہات کا یہ علاج

(۱) آزادی ختم ہوتی ہے (۲) ظلم وستم (۳) ''جس وقت مختلف امور میں اختیار عطا کیا جائے تو میں اپنے واسطے ایک معبود پسند کروں یا ایک ہزار کو میں نے لات اور عزیٰ کو چھوڑ دیا ہے اور سمجھ دار آدمی ایسا ہی کرتا ہے''۔

نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو دفع کرو بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشا کا علاج کرو ہر شبہ کو الگ الگ دفع کرنے میں دردسری بھی ہے اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم بھی نہیں ہوسکتا تم منشا کا علاج کرو ان شاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہوجائیں گے اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے اور چھچھوندر کودتے پھرتے تھے اور گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر باہر نکالتا تھا مگر وہ پھر سب کے سب اندر آجاتے تھے ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں تم لیمپ روشن کردو یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا چنانچہ لیمپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر اُدھر اپنے بل میں گھس گئے۔ اسی طرح یہاں سمجھ لو کہ یہ وساوس وشبہات جو وحی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں ان کا منشا ظلمتِ قلب ہے جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کرلو! پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئیگا اور وہ نور کیا ہے؟ نورِ محبت الٰہی ہے۔

نورِ محبت کا فائدہ

حضرت محبت وعشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول وفعل میں کوئی شبہ اور وسوسہ پیدا نہیں ہوتا اگر ایک پروفیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہوجائے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر بازار کپڑے اتار کر ننگے آؤ تو میں تم سے بات کرونگی ورنہ نہیں، تو فلسفی صاحب اس کے لئے فوراً تیار ہوجائینگے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی! اس میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی عقل وفلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی افسوس قرآن وحدیث کے مقابلہ میں تو ساری فلسفیت ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنی مردار کے احکام میں چون وچرا اور لم وکیف سب رخصت ہوگیا

آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اس کی وجہ محبت وعشق ہے بس معلوم ہوگیا کہ خدا اور رسول ﷺ کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدمِ محبت یا قلتِ محبت ہے اگر آپ کے دل میں نورِ محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور چھچھوندر خود بھاگ جاتے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے زآب وگل ربایدہمہ صبر وآرام دل (۱)

اور جب ایک مخلوق کے عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہئے ؎

عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحرمعنی غریق
زمام شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند (۲)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوئے گشتن بہرا و اولےٰ بود (۳)

علماء کو نصیحت

اور میں علماء کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء کے عرفی اخلاقی ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہوگئے ارے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اکھاڑو تم شاخوں کو چھانٹتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے جب جڑ موجود ہے تو چند روز

(۱) تیرے عشق کا پیالہ جب سے میں نے پیا ہے میرے دل کا چین وقرار رخصت ہوگیا ہے (۲) سالکین طریق کا عجیب حال ہے کہ عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں غم کی شراب چڑھائے جارہے ہیں اگر اس میں تلخی اتر گئی بھی ہو تو ایک ہی سانس میں پی جاتے ہیں (۳) مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیونکر کم ہوسکتا ہے لیلیٰ کے عشق پر مبتلا ہونے سے بہتر ہے کہ مولیٰ کا عشق پیدا کرو۔

میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئینگے محقق تشخیص کر کے اصل مرض کا علاج کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے' میں نہایت پختگی سے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آج کل مذہب میں شکوک واوہام پیدا ہوتے ہیں ان کے اس مرض کا منشا قلت محبت مع اللہ ہے ان کو اللہ ورسول کے ساتھ محبت نہیں ہے تعلق نہیں ہے' اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے اہلِ محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہوجاتی ہے جیسا کہ اہلِ غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوجائے گا یہ لم وکیف باطل اور وساوس وشبہات سب جاتے رہینگے (۱)۔ میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شبہات کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاتے ہو بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت ومحبت کا پتہ دے دو۔

ناواقفِ فن سے علاج کروانے کا نقصان

ورنہ تمہاری ساری تدبیروں اور تقریروں کا وہی حال ہوگا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائے مثنوی میں ناواقف طبیبوں کی تدبیر کا حال بیان فرمایا ہے کہ ایک بادشاہ کی کنیزک بیمار تھی اطباء نے اس کا مرض سوداء وصفراء تجویز کر کے دوائیں دینا شروع کیں اس کے بعد طبیب الٰہی آیا وراس نے تجویز کیا کہ ؎

رنجش از سوداء و از صفرا نبود بوئے ہر ہیزم پدید آید زدود

اس کو سوداء یا صفراء کا مرض نہیں بلکہ یہ تو ایک زرگر کے عشق میں گرفتار ہے اور اس نے دوسرے طبیبوں کی تدبیروں کے متعلق یوں کہا ؎

(۱) یہ کیوں اور کیسے کے سوالات اور شبہات وساوس سب ختم ہوجائیں گے۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال دروں استعیذ اللہ مما یفترون(۱)

اصل مرض سے آنکھیں بند کر کے آثار سے علاج کرنا ایسا ہے جیسا ایک شخص پاخانہ لیے بیٹھا ہو اور بدبو آرہی ہو اور تم پاخانہ کو تو نہیں دھوتے اوپر سے عطر حنا اور عطر خس لگا رہے ہو اس سے کیا ہوتا ہے جب تک پاخانہ کو دور نہ کرو گے تمہارے سارے عطر برباد ہو جائیں گے۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج کل علماء بھی خود طریق علاج نہیں جانتے۔

بغیر استاد ترجمہ قرآن پڑھنا درست نہیں

تو اب عوام نے اپنا علاج خود کرنا شروع کیا کہ قرآن و حدیث کا ترجمہ پڑھنے لگے اور ترجمہ دیکھ کر شبہات کا خود ہی جواب دینے لگے مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ ایسے عوام کو خود ترجمہ پڑھنا حرام ہے۔ بلکہ تم کو لازم ہے کہ کسی محقق سے رجوع کرو اور جو طریق وہ بتلائے اس پر عمل کرو اپنی رائے کو دخل نہ دو پھر وہ ہی تم کو قرآن کا ترجمہ پڑھائیگا یا پڑھنے کی رائے دیگا مگر قابل بنا کر۔ اور اگر اس کے سامنے بھی اپنی رائے چلائیں گے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے اپنے بچہ کے لئے تم ایک نصاب تعلیم تجویز کرو اور وہ اسمیں اپنی رائے کو دخل دے تو کیا آپ کو اس کی رائے کی کچھ وقعت ہوگی؟ ہرگز نہیں۔

تقلید کی اہمیت وضرورت

صاحبو! دین و دنیا کا کوئی کام بدون تقلید محقق کے نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے اگر

(۱) اس جسم کی اصلاح کے لئے جو بھی دواء کی گئی اس نے اس کو مزید خراب کیا اندرونی حال سے بے خبر ہیں' میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں جو وہ افترا بردازی کرتے ہیں۔

ایک سرکاری مکان دو لاکھ روپے میں تیار ہوا ہو مگر انجینئر اس کو پاس نہ کرے اور یہ کہے کہ دو ماہ میں یہ مکان گر جائیگا تو اسی وقت لاکھوں کی عمارت کو بیکار کر دیا جاتا ہے اور اس کو خالی کر دیا جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ گرا دیا جاتا ہے یہاں کوئی اپنی عقل کو دخل نہیں دیتا بلکہ بلا چون و چرا انجینئر کی تقلید کی جاتی ہے یہی حال ڈاکٹروں کی تقلید کا ہے کہ انکی تجویز میں کوئی دخل نہیں دیتا صاحبو! جن لوگوں کی تقلید میں آپ عقل پرستی کرتے ہیں وہ تو خود بھی عقل پرستی نہیں کرتے ہاں عاقل پرستی کرتے ہیں۔ پس قرآن میں ہر بات کو اور ہر نئی تحقیق کو اپنی رائے سے ٹھونسنا سخت غلطی ہے آپ کی رائے باطل ہے کیونکہ آپ محقق نہیں ہیں۔

صرف ترجمہ پڑھ کر قرآن کا مطلب بیان کرنے کی حقیقت

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جب علماء یہ کام نہیں کرتے تو ہم نے کہا لاؤ ہم ہی یہ کام کریں کیونکہ علماء تو پرانی لکیر کے فقیر ہیں وہ جدید تحقیقات کا ثبوت قرآن و حدیث سے نہیں دیتے تو یہ کام ہم ہی نے شروع کر دیا۔

میں کہتا ہوں بیشک مگر آپ کے کام کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی طبیب کا لڑکا اپنے باپ کے ساتھ مطب میں اور مریضوں کو دیکھنے جایا کرتا تھا مگر خود اسے گھر کی عقل نہ تھی ایک دفعہ اس کے باپ نے کسی مریض کی نبض دیکھ کر کہا کہ آج معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے مریض نے اقرار کیا' حکیم صاحب نے اس کو پرہیز کی تاکید کر کے نسخہ لکھ دیا۔ جب واپس ہوئے تو لڑکے نے باپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے؟ کہا نبض سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ اس نے کوئی شے محرک صفراء[1] کھائی ہے پھر چارپائی کے نیچے جو میں نے نظر کی تو نارنگی کے چھلکے نظر آئے اس سے میں سمجھا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ بس

(۱) صفرا دیت بڑھانے والی شئے کھائی ہے۔

صاحبزادے کے ایک قاعدہ ہاتھ آ گیا کہ مریض کے پلنگ کے نیچے جو چیز پڑی ہو اس نے وہی کھائی ہے جب حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا اور صاحبزادہ کی نوبت آئی تو آپ ایک رئیس کی نبض دیکھنے گئے اور چارپائی کے نیچے نظر دوڑا کر کہنے لگے کہ آپ نے آج نمدہ(۱) کھایا ہے (کیونکہ چارپائی کے نیچے نمدہ ہی پڑا تھا ۱۲ظ) رئیس نے کہا کہ نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے کہا کچھ ہی ہو نبض تو یہی بتلاتی ہے رئیس نے حکم دیا اس کی دم سے نمدہ باندھ کر گھر سے باہر نکال دو۔ یہ تو بالکل جاہل مطلق معلوم ہوتا ہے، تو حضرت اسی طرح آپ کی حالت ہوگی کیونکہ آپ کو گھر کی تو عقل نہیں شریعت سے اور قرآن سے مناسبت نہیں نہ معلوم آپ اس میں کیا سے کیا ٹھونسیں گے۔

علماء کی ذمہ داری

صاحبو! علماء کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن میں صنعت وحرفت ٹھونسیں اور نہ قرآن صنعت وحرفت کی کتاب ہے۔ بلکہ قرآن قانونِ الٰہی ہے اور علماء کا کام وہ ہے جو وکلا کا کام ہوتا ہے کہ وکیل صرف یہ بتلاتا ہے کہ یہ امر قانون کے موافق ہے یا خلاف ہے، اس سے زیادہ وکیل کا کام کچھ نہیں کہ مثلاً اس سے قانون کی لِـم (۲) پوچھی جاوے، اسی طرح علماء کا اس سے زیادہ کچھ کام نہیں کہ جس بات کے متعلق شبہ ہو کہ یہ قانون کے خلاف تو نہیں ہے کہ اس کو علماء سے پوچھ لو وہ قانون الٰہی کے موافق یا مخالفت ہونے کو واضح کر دیں گے نہ انکا یہ کام ہے کہ اس قانون کی لِـم بتلادیں نہ یہ کام ہے کہ تمام سائنس کی تحقیقات کو قرآن میں داخل کریں اسی طرح نہ ان کا یہ کام ہے کہ قومی کاموں میں حصہ لیں نہ یہ کہ اس کے لئے چندہ کریں۔ انکا کام صرف قانونِ الٰہی کو سمجھنا ہے اور ان سے یہی پوچھنا بھی چاہئے کہ یہ بات قانون الٰہی کے تو خلاف نہیں۔ اور یاد رکھو اگر سب لوگ میدان میں آجائیں گے تو

(۱) کارپٹ (۲) قانون کی وجہ پوچھی جائے۔

چندروز کے بعد قرآن وحدیث کا سمجھنے والا آپ کو کوئی نہ ملے گا میں علماء کے میدان میں آنے کا من کل وجہ[1] مخالف نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ سب کو میدان میں نکلنا جائز نہیں ہاں جب علماء علم دین کو اچھی طرح حاصل کرلیں تو جن کو میدان میں نکلنے کا شوق ہو وہ آئیں مگر کچھ لوگ حجرہ نشین بھی رہنا چاہئیں جن کا کام سوائے قال اللّٰہ قال الرسول اور سوائے کتابیں پڑھنے پڑھانے کے کچھ نہ ہو کیونکہ تجربہ ہے کہ کتابی استعداد اور فتویٰ دینے کی قابلیت بدون اس کے کامل نہیں ہوتی جو علماء میدان میں آئے ہوئے ہیں ان میں اکثر تو وہ ہیں جن کو کتابی استعداد بالکل نہیں اور اگر کسی کو یہ قابلیت حاصل ہے تو یہ حجرہ نشینی ہی کی برکت ہے کہ وہ ایک مدت تک حجرہ نشین ہوکر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا ہے مگر آپ اس حجرہ ہی کو بند کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چندروز میں حدیث وقرآن وفقہ کے سمجھنے والے اور انکو صحیح طور پر حل کرنے والے دنیا سے ناپید ہوجائیں گے۔ اگر اس کی ضرورت کو آپ محسوس کرتے ہیں اور یقیناً ہر شخص اس کی ضرورت کو تسلیم کریگا تو ضروری ہے کہ سب علماء میدان میں نہ آئیں بلکہ کچھ میدان میں آئیں اور کچھ مناظرہ کریں کچھ تبلیغ کریں اور ایک جماعت ایسی ہو جو ان سب کاموں سے الگ رہ کر حدیث وقرآن وفقہ اور ضروریات کی تعلیم دے۔ ان کو سوائے تعلیم وتعلم کے کچھ نہ کرنا چاہئیے ورنہ قابل علماء ہرگز پیدا نہ ہونگے۔ تقسیم خدمات بہت ضروری ہے اور تمام عقلاء اور متمدن اقوام اس کی ضرورت پر متفق ہیں پھر حیرت ہے کہ ہمارے بھائی اس کو نظر انداز کرکے سب کو ایک کام میں کیوں لگانا چاہتے ہیں بعض لوگوں نے اس کا نام رکھا ہے ''مل کر کام کرنا''۔

---

(۱) بالکلیہ مخالف نہیں۔

''مل کر کام کرنے'' کا مطلب

سو صاحبو! مل کر کام کرنے کے یہ معنی نہیں کہ بڑھئی اور معمار سب کے سب ایک ہی کام کو لگ جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مکان بنانے میں جتنے کاموں کی ضرورت ہے ان کو بانٹ کر ایک کام بڑھئی کرے ایک کام لوہار کرے ایک کام معمار کرے جب ہی کام تیار ہوگا ورنہ بڑھئی اور معمار اور لوہار سب کے سب اینٹوں ہی کے کام میں لگ گئے تو مکان ہرگز تیار نہ ہوگا۔ بس اب یہ کہنا غلط ہے کہ علماء کام نہیں کرتے علماء کا جو کام ہے جس کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہے وہ اس کو بحمداللہ بخوبی کر رہے ہیں آپ کو ان کے کام میں دخل دینے کی ضرورت نہیں آپ اپنی رائے سے قرآن وحدیث میں غیر ضروری اور فضول باتوں کو نہ ٹھونسئے اور اپنی تحقیقات کو شریعت میں داخل نہ کیجئے بلکہ قرآن و حدیث کو ان لوگوں پر چھوڑ دیجئے جو اس کے سمجھنے والے ہیں اور اس معاملہ میں آپ کو انہی کی تقلید کرنی چاہئے اپنی رائے سے قرآن و حدیث میں کسی چیز کا ٹھونسنا آپ کو جائز نہیں بلکہ سراسر حماقت ہے چونکہ آج کل لوگوں میں یہ مرض عام ہوگیا ہے اس لئے استطراداً اس کا بیان کردیا گیا۔

کسی تحقیق کو قرآن سے ثابت کرنا درست نہیں

چنانچہ میں ایک جگہ گیا ہوا تھا وہاں ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آج کل تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں نر و مادہ ہوتے ہیں نباتات (۱) میں بھی اشجار (۲) میں بھی تو مجھے فکر ہوئی کہ قرآن میں اس مضمون کا کہاں ذکر ہے گویا وہ تحقیق تو ان کے نزدیک وحی سے بھی زیادہ تھی کہ اس کے لئے تو کسی دلیل کی

(۱) پودوں میں (۲) درختوں میں۔

بھی ضرورت نہ تھی اس پر ایمان لانے کیلئے تو اتنا کافی ہوگیا کہ اخبار میں پڑھ لیا کہ آج کل تحقیقات سے یہ ثابت ہوگئی ہے' افسوس یہ لوگ قرآن وحدیث کو تو بدون اپنی مزعوم (۱) دلیل کے ماننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اس میں شکوک وشبہات نکالتے ہیں اور نئی تحقیقات پر صرف اخبار میں دیکھ کر ایمان لے آتے ہیں اس بے انصافی اور بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہے۔ پھر اس کے بعد یہ قاعدہ بھی ثابت کرلیا کہ قرآن میں ہر واقعی بات مذکور ہونی چاہئے اور اس کے متعلق کسی بزرگ کی طرف ایک شعر منسوب کیا جاتا ہے ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ تُقَاصِرُ عَنْہُ اَفْھَامُ الرِّجَالِ

(قرآن میں تمام علوم ہیں لیکن لوگوں کی افہام اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں ۱۲ ظ)

مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو سند صحیح سے اس کا ثبوت دو کہ یہ شعر کس بزرگ کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسمیں یہی تو کہا گیا ہے کہ قرآن میں تمام علوم ہیں جمیع الجھل فی القران (۲) تو نہیں کہا تو اب تم اس کا ثبوت دو کہ جن تحقیقات کو تم قرآن میں ٹھونستے ہو یہ علم ہے جہل نہیں۔ اور اگر علم سے مراد مطلق دانستن ہے (۳) تو میں کہوں گا کہ اگر ویسرائے کا امتحان قانون وغیرہ میں ہو رہا ہو تو کیا کوئی اس وقت یہ کہے گا کہ ویسرائے کا امتحان پارچہ سازی و پارچہ دوزی (۴) میں بھی ہونا چاہئے کیونکہ علم لغوی تو یہ بھی ہے یقیناً کوئی اس کی جرأت نہ کریگا بلکہ یہ کہا جائیگا کہ ویسرائے کے علم کے سامنے یہ جہل ہے علم نہیں اسی طرح جن باتوں کو آپ قرآن میں اپنی رائے سے ٹھونستے ہیں وہ علوم قرآن وحدیث کے سامنے علم نہیں بلکہ جہل محض ہیں۔

(۱) اپنی پسندیدہ (۲) ہر جہل قرآن میں ہے تو نہیں کہا (۳) علم سے مراد اگر صرف جاننا ہے (۴) کپڑے بنانے اور کپڑے سینے میں بھی ہونا چاہئے۔

عوام کا ترجمہ سے استدلال کی حقیقت

غرض وہ صاحب بڑے حیران تھے کہ قرآن میں یہ مسئلہ کہاں ہے کہ نباتات وغیرہ میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں تو انہوں نے تمام ترجمے دیکھے اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ اس خیال سے بڑے اہتمام سے دیکھا کہ وہ نئی روشنی کے مفسر ہیں شاید انہوں نے نئی تحقیقات کو قرآن میں ٹھونسا ہو باقی یہ مدرسوں اور مسجدوں کے مُلّا نے تو لکیر کے فقیر ہیں ان سے کیا امید ہے کہ سلف کے اقوال پر کچھ زیادتی کریں گے مگر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ میں بھی کہیں اس مسئلہ کا ذکر نہ ملا کیونکہ گو وہ نئی روشنی کے مفسر تھے مگر عمر میں پرانے ہی تھے اس لئے وہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح ٹھوس نہ تھے کہ قرآن میں جو چاہیں ٹھونس دیں اور میں آپ کو ایک بشارت سناتا ہوں کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے میں بہت سی غلطیاں تھیں جن پر میں نے ایک رسالہ میں تنبیہ کی تھی ڈپٹی صاحب نے میری تنقید کو پسند کیا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کے بعد طبع ثانی میں ان اغلاط کو صحیح کردوں گا مگر ان کو موقع نہ ملا۔ تو وہ صاحب کہتے تھے کہ جب مجھے کسی ترجمہ میں یہ مضمون نہ ملا اور مایوسی ہوگئی تو پھر ایک دن میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی سورۂ یسین میں جب اس آیت پر پہنچی: ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَایَعْلَمُوْنَ﴾(۱) تو میرا ذہن فوراً اس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ ہر شے میں نر و مادہ ہیں (اور عجیب بات ہے کہ یہ مسئلہ آپ کو قرآن میں بیوی کی قراءت سے سمجھ میں آیا خود مطالعہ کرنے میں سمجھ میں نہ آیا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ نر و مادہ کا مسئلہ نر و مادہ کے اجتماع سے حل

(۱) سورۂ یسین: ۳۶۔

ہوسکتا ہے ۱۲ ظ) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا ہے کہ" پاک ہے وہ ذات جس نے تمام ازواج کو پیدا کیا زمین کی نباتات سے بھی اور خود تمہاری جنس میں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو تم نہیں جانتے" اور ازواج کے معنی نر و مادہ کے ہیں' میں نے کہا سبحان اللہ! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ زوج کے معنی نر و مادہ کے ہیں زوج کے معنی لغت میں جوڑے کے ہیں چنانچہ زوج الخف موزے کے جوڑے کو کہتے ہیں اور زوج و فرد جفت وطاق کو کہتے ہیں کیا یہاں بھی آپ نر و مادہ کے معنی کریں گے؟ ہرگز نہیں اور میاں بیوی کو بھی ازواج اسی لئے کہتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کا جوڑہ ہے پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں مختلف اقسام پیدا کی ہیں نباتات میں بھی انسانوں میں بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو تم نہیں جانتے اور اقسام مختلفہ کو ازواج اس واسطے کہا گیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مقسم کے افراد ہیں گویا باہم جوڑے ہیں۔

یہ ہے آج کل کے استدلالات کی حقیقت جن کو سن کر ادنیٰ طالب علم بھی ہنستا ہے کہ یہ استدلال قرآن سے کیونکر ہوا۔

جاہلانہ استدلال کا الزامی جواب

بس یہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک جاہل کو لایا گیا تھا کہ حضرت یہ ماں کو نفقہ نہیں دیتا بلکہ ساری کمائی بیوی کو دے دیتا ہے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے وجہ پوچھی' تو کہا قرآن میں ماں کا حق کہیں نہیں اور بیوی کا ہے ﴿ اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ ﴾ کو آپ نے مِنْ جُوْعٍ پڑھا کہ کھانا دو جوی کو یعنی زوجہ کو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تو نے قرآن کا ترجمہ و تفسیر پڑھی ہے کہا نہیں پوچھا قرآن پڑھا ہے کہا نہیں صرف چند سورتیں

شروع کی پارۂ عم سے یاد ہیں (اس قابلیت پر آپ کا یہ اجتہاد تھا کہ قرآن میں ماں کا حق نہیں ہے ۱۲ظ) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم نے سورۂ تبت یدا ابی لھب بھی پڑھی ہے کہا جی ہاں فرمایا ذرا سنا دو تو اس نے پڑھنا شروع کیا ﴿ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴾(۱) فرمایا دیکھو قرآن میں تو یہ ہے کہ ماں کا ہے سب، جو کچھ ہے سب ماں ہی کا ہے بیوی کا تو صرف نفقہ ہے کہنے لگا جی ہاں اب سمجھ گیا اب میں ماں کو بھی دیا کروں گا۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قرآن سے استدلال ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ الزامی جواب تھا کہ جیسی تفسیر تم نے ﴿اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ﴾ کی کی ہے ویسی ہی تفسیر پر قرآن سے یہ مسئلہ بھی نکل سکتا ہے۔ بس اسی طرح جو مسائل آج کل کے ذہین لوگ قرآن میں ٹھونستے ہیں وہ قرآن سے اسی طرح ثابت ہوتے ہیں جس طرح سورۂ ایلاف سے سورۂ تبت سے یہ مضامین ثابت ہوئے تھے۔

مضامینِ قرآن میں رائے زنی سے احتراز کریں

ایک صاحب نے قرآن سے یہ مسئلہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ منی میں کیڑے ہوتے ہیں ان کیڑوں سے بچہ بنتا ہے تو آپ نے ﴿ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴾(۲) سے اس مسئلہ کو ثابت کیا اور لکھا کہ عَلَقٌ لغت میں جونک کو کہتے ہیں اور وہ بھی ایک کیڑا ہے تو قرآن سے ثابت ہوگیا کہ بچہ منی کے کیڑوں سے بنتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن سے تو یہ ثابت نہ ہوا بلکہ اگر تمہارے ترجمہ کو مان لیا جائے تو یہ ثابت ہوا کہ انسان کو جونک سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے تو سائنس والے بھی قائل نہیں۔ تو افسوس تم نے قرآن کا ترجمہ بھی بگاڑا اور مقصود پھر بھی ثابت نہ ہوا۔ ان سب اختراعات کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی رائے کو اس قابل سمجھتے ہیں

(۱) ''ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی'' سورۂ لہب: ۱،۲ (۲) ''جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا'' سورۂ علق: ۲۔

کہ قرآن کو اس سے حل کریں' صاحبو! عوام کو لازم ہے کہ اپنے کو جاہل سمجھیں عاقل اور ذی رائے نہ سمجھیں اور اگر عاقل و ذی رائے سمجھیں تو دنیا کی باتوں میں رائے چلالیا کریں قرآن و حدیث کو تختۂ مشق نہ بنائیں بلکہ علماء کو بھی لازم ہے کہ اپنے کو عالم نہ سمجھیں مگر جاہل بھی نہ سمجھیں کہ اس میں ناشکری ہے بلکہ علماء سابقین سے اپنے کو کم سمجھیں صاحبو! آج کل جو لوگ قرآن میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں ان کو ایمان عزیز نہیں ورنہ اگر جان کی طرح ان کو ایمان بھی عزیز ہوتا تو قرآن میں اپنی رائے کو نہ ٹھونستے نہ علماء سے مزاحمت کرتے جیسا کہ اطباء سے مزاحمت نہیں کرتے اور اگر وہاں طبیب یا ڈاکٹر کی رائے سے مزاحمت کرینگے تو وہ نکال باہر کرے گا پھر نہ معلوم دین ہی اتنا سستا کیوں ہے کہ اسمیں ہر شخص اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

اپنے ایمان کی قدر کرو

بس ایمان کو تو یوں سمجھ لیا ہے کہ ہم کو خود لپٹتا پھرتا ہے کہ جب لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہہ لیں گے بس ایمان آجائیگا اور اگر کبھی چلا بھی جائیگا تو پھر کلمہ پڑھ لینے سے واپس آجائیگا اسی لئے بیوی کا نکاح ٹوٹنے کا تو لوگوں کو خوف ہوتا ہے مگر ایمان جانے کا خوف نہیں ہوتا سو یاد رکھو بیشک ایمان لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہہ لینے سے ہر بار لوٹ آتا ہے اور چاہے کتنی دفعہ کفر کرے اس سے ایمان تازہ ہوجائیگا مگر اس فعل میں اس بیوفائی میں خاصیت یہ ہے کہ پھر ایمان کی توفیق ہی نہ ہوگی قرآن میں ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ آمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا﴾[1] حالانکہ ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾ کے بعد بھی ﴿ثُمَّ آمَنُوْا﴾ کی گنجائش تھی مگر اس کے بعد حق تعالیٰ نے ﴿ثُمَّ آمَنُوْا﴾ نہیں فرمایا کیونکہ اس پر متنبہ کرنا

(۱) ''بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو رستہ دکھائینگے'' سورۂ نساء: ۱۳۷۔

مقصود ہے کہ اس فعل میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے بعد اکثر توفیقِ ایمان نہیں ہوتی پس ایمان کی قدر کرو اور اس کی حفاظت کی کوشش کرو قرآن وحدیث میں اپنی رائے کو دخل نہ دو اور نہ علماء سے مزاحمت کرو بلکہ اپنے کو محققین کے سپرد کرو اس سے شبہات و وساوس کا دروازہ بند ہوجائیگا چونکہ آج کل یہ مرض عام ہے اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کردی۔

علمِ دین کے مقابلے میں علمِ دنیا جہل ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت مجھے حقوق نکاح کا بیان مقصود نہیں نہ اس واسطے کہ وہ مقصود بالذات نہیں کیونکہ اگر مقصود بالذات نہ ہوتے تو قرآن وحدیث میں ان کا ذکر نہ ہوتا بلکہ مجھے اس آیت سے ایک اور مضمون کی تائید کرنا مطلوب ہے اور میں اس آیت سے اس مضمون کو ثابت کرنا نہیں چاہتا صرف تائید کرنا چاہتا ہوں آج کل یہ بھی ایک عام غلطی ہے کہ ثبوت اور نظیر و تائید کو ایک سمجھتے ہیں ان لوگوں کو علم خاک نہیں اگر انگریزی کی منطق کے بعد یہ لوگ عربی منطق پڑھیں تو معلوم ہو کہ انگریزی منطق محض بچوں کی باتیں ہیں۔ واللہ علماء کے سامنے ان لوگوں کو نہ علم ہے نہ عقل ہے کیونکہ انہوں نے علوم کی صورت ہی نہیں دیکھی عربی کے علوم وہ ہیں کہ ایک معمولی طالب علم کے سامنے بھی بڑے سے بڑا انگریزی دان طفل مکتب ہے اور جو فاضل علماء ہیں وہ تو ان سے ہزار درجہ اعقل ہیں۔ (۱)

آج کل کا معیار قابلیت

مگر آج کل مولویوں کی وقعت اس لئے نہیں ہے کہ انکا لباس خستہ ہے اور انگریزی دانوں کا لباس قیمتی ہے اور آج کل لیاقت کا معیار لباس ہی رہ گیا ہے

(۱) ہزار درجہ زیادہ عقلمند ہیں۔

چنانچہ ہم جب شملہ گئے تھے تو حالانکہ ہم لوگ بحمد اللہ معمولی لباس نہیں پہنتے اوسط درجہ کا اچھا لباس پہنتے ہیں مگر بعض جنٹلمینوں کی نظر میں وہ اتنا گھٹیا تھا کہ جب میں بیان کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو ایک صاحب کرنل عبدالمجید خان سے جو ہمارے وعظ کے مشتہر تھے کہنے لگے کہ آپ کے مولویوں کا لباس تو ایسا ہے کہ گویا ابھی پاخانہ سے نکلے آرہے ہوں (مطلب یہ تھا کہ بس ان کی لیاقت بھی ایسی ہی ہوگی) کرنل صاحب نے کہا کہ میں اس سوال کا جواب ابھی نہیں دینا چاہتا وعظ ختم ہونے کے بعد جواب دوں گا چنانچہ جب میرا بیان ختم ہوگیا تو کرنل صاحب نے کہا ہاں صاحب اب فرمایئے کیا فرماتے تھے کہنے لگے اب کیا کہوں میری سخت حماقت تھی کہ میں لیاقت کا معیار لباس کو سمجھتا تھا اب معلوم ہوا کہ لیاقت اور قابلیت دوسری شے ہے ذرا دیکھئے تو سہی یہ ان لوگوں کی عقل کا حال ہے کہ لباس کو معیارِ لیاقت و قابلیت سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم یہ کہاں کی عقل ہے مجھے جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ میں ان لوگوں کے ضرور کان کھولوں گا۔

اعتراض کا شافی جواب

چنانچہ اس کے بعد جب دوبارہ میرا بیان ہوا تو میں نے اسکا جواب دیا مگر تہذیب کے ساتھ۔ گو انہوں نے تو اعتراض بدتمیزی سے کیا تھا مگر میں نے جواب میں تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا میں نے بیان سے پہلے بطور تمہید کے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں بعض صاحبوں کو ہمارے لباس پر اعتراض ہے اور ممکن ہے کہ انکی نیت اس میں اچھی ہو وہ یہ کہ اگر واعظ کا لباس قیمتی ہوگا تو سامعین کے قلوب میں اس کی عظمت ہوگی اور عظمت سے بیان کا اثر زیادہ ہوگا اور اس نیت کے ساتھ اس اعتراض کا منشا خیر خواہی ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ علماء آپ

حضرات کے خیال کے موافق لباس کہاں سے لائیں کیونکہ مولویوں کے پاس اتنی آمدنی کہاں جس سے قیمتی لباس تیار کریں ان میں تو اکثر کی آمدنی بیس پچیس تیس روپے ماہوار ہے اور جو زیادہ عروج ہوا تو پچاس روپے کی تنخواہ ہوگئی تو اتنی آمدنی میں تو وہ ایسا ہی لباس بنا سکتے ہیں جیسا وہ پہن رہے ہیں مگر وہ مصلحت بھی قابل لحاظ ہے جو قیمتی لباس میں ہے کیونکہ بعض لوگوں گا یہ مذاق بھی ہے کہ ان کی نظر میں لباس ہی سے لیاقت و قابلیت ظاہر ہوتی ہے تو اب اس کی صورت کیا ہو کہ یہ مصلحت بھی حاصل ہو اور مولویوں کا عذر بھی ملحوظ رہے میرے ذہن میں اس کی یہ صورت آتی ہے کہ آپ حضرات علماء کے لئے اپنے مال سے جوڑے تیار کریں۔ اور اس سے نہ گھبرائیے گا کہ ہم لوگ وہ جوڑے لیکر اپنے گھر چلدیں گے ہرگز نہیں بلکہ انجمن میں اسی غرض سے داخل کردیں کہ وہ ان کو صرف وعظ کے وقت پہن لیا کریں گے اور جاتے ہوئے انجمن میں واپس دے جائیں گے تاکہ وہ دوسرے واعظوں کے کام آویں جب کوئی مولوی معمولی لباس میں آوے آپ اس کو یہ کپڑے پہنا دیجئے کہ انکو پہن کر وعظ کہو۔ اس صورت میں آپ کا زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا بس جو کچھ ہونا ہوگا ایک دفعہ ہوجائیگا مگر اس کے بعد اس طرح یہ مقصود سہولت کے ساتھ حاصل ہوسکتا ہے اب میں منتظر ہوں کہ معترض صاحب اس کا انتظام کرتے ہیں یا نہیں اگر ان میں کچھ بھی غیرت ہے تو ضرور ہمارے واسطے جوڑے تیار ہونگے ورنہ ان کو چاہئے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مریں (بس صرف یہ ایک جملہ میں نے تیز کہا) آپ نے دیکھا کہ آج کل یہ تمیز رہ گئی ہے کہ علماء کے پاس چونکہ لباس قیمتی نہیں اس لئے ان کی وقعت نہیں۔

علوم جدیدہ کے حاملین اور علماء دین میں فرق

دوسرے ان کے پاس دعوی نہیں کیونکہ ان کو یہ مضمون یاد ہے۔

ہر کہ گردن بدعوئے افرازد خویشتن را بگردن اندازد (۱)

اور آج کل اسی کی وقعت ہے جو خود اپنی زبان سے کہتا ہو کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں اور علماء بیچارے تو خود یہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہم کو کچھ نہیں آتا اور تو اور وہ بیچارے تو ڈر کے مارے ایمان کا بھی دعویٰ نہیں کرتے ہاں تحدّث بالنعمۃ کے طور پر یوں کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو ایمان عطا کیا ہے دعویٰ نہیں کرتے بس ان کی تواضع نے اہل دنیا کو شیر کر دیا وہ یہ سمجھنے لگے کہ جب یہ خود اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ نہیں آتا اور مولوی ہو کر یہ جھوٹ نہیں بول سکتے تو یہ واقع میں کچھ نہیں ہونگے یہ آج کل کی عقل ہے جو ان حضرات کو مبارک ہو ورنہ حقیقت میں علماء کے سامنے انگریزی منطق پڑھے ہوئے خاک بھی وقعت نہیں رکھتے وہ استحالہ و استبعاد میں امتناع و تعدد میں نہی اور نفی تک (۲) میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔ مگر علماء ان میں فرق کرتے ہیں اور ہر اک کی حقیقت کو الگ الگ جانتے ہیں اس لئے میں نے کہہ دیا کہ اس آیت میں اس مضمون کو جو اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں ثابت نہ کروں گا بلکہ آیت سے صرف تائید کروں گا اور یہ حفظ حدود ہے کہ ہر مضمون کو اس کی حد پر رکھا جائے چونکہ اس سے پہلے ﴿وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہ﴾ کا بیان ہوا تھا جس میں بتلایا گیا تھا کہ شریعت میں حفظ حدود کا بڑا اہتمام ہے اس لئے میں نے اس پر متنبہ کر دیا کہ حفظ حدود میں یہ بھی داخل ہے کہ دلالت کلام کے درجات کا لحاظ رکھا جائے کہ جو مضمون جس درجہ میں مدلول کلام ہو اس کو اس سے آگے نہ بڑھایا جائے۔

(۱) جو آدمی دعوے کے ساتھ گردن اونچی کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو خود نیچے گرانے کے مترادف ہے (۲) وہ اس بات میں بھی فرق نہیں کر سکتے کہ کونسی چیز محال ہے اور کونسی بعید ہے۔

ترجمہ وتفسیرِ آیت

اب میں اول آیت کا ترجمہ کرتا ہوں اس کے بعد مضمون مقصود کی تائید کروں گا ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ" خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے یعنی ازواج(۱) کو پیدا کیا تا کہ تم کو ان سے سکون قلب حاصل ہو"۔ یہ نکاح کا اصل موضوع لہٗ ہے یعنی سکون حاصل ہونا باقی خدمت وغیرہ یہ سب فروع ہیں ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ "اور تمہارے درمیان باہم محبت اور ہمدردی پیدا کی"۔

نکاح کے بعد میاں بیوی میں محبت ہونا دلائل قدرت میں سے ہے

یہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے کہ جو دو شخص ابھی ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھے اب ان میں نکاح کے بعد کیسی محبت ہو جاتی ہے کہ دوسرے تعلقات میں اس کی نظیر نہیں ملتی اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کو صیغۂ امر سے بیان نہیں کیا کہ "تم کو آپس میں مودت و رحمت کا برتاؤ رکھنا چاہئے" بلکہ صیغۂ خبر سے بیان فرمایا کہ "ہم نے تمہارے درمیان خاص تعلق پیدا کر دیا" یعنی ہم نے تمہاری مدد کی ہے بدون ہماری مدد کے اجنبیت میں ایسا تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔

مودّت اور رحمت میں فرق

اور یہاں مودت(۲) ورحمت(۳) دو لفظ اختیار کئے گئے اس سے مطلب یہ ہے کہ اس تعلق میں کبھی مودت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی رحمت و ہمدردی کا چنانچہ ابتدا میں عموماً محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور انتہا میں رحمت و ہمدردی کا اور اس

(۱) بیویوں (۲) عشق ومحبت (۳) رحمت و ہمدردی۔

عنوان میں عورتوں کی اُس شکایت کا بھی جواب ہوگیا جو عورتوں کو مردوں سے اکثر ہوا کرتی ہے جب نکاح کو چند سال گذر جاتے ہیں تو عورتیں مردوں سے کہا کرتی ہیں کہ اب تمہارے دل میں ہماری ویسی محبت نہیں رہی جیسی شروع میں تھی اب وہ ولولہ اور تقاضا اور جوش عشق نہیں رہا اس شکایت کا منشا جہل ہے اور اگر مرد لاجواب ہوجائے تو یہ اس کا جہل ہے دونوں جاہل ہونگے تو شکایت بڑھے گی' عاقل اس اعتراض کو کبھی تسلیم نہ کریگا وہ اس کا یہ جواب دیگا کہ قاعدہ یہ ہے کہ قدامت (۱) کے بعد جوش کم ہوجاتا ہے مگر جوش کا کم ہوجانا زوالِ محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمالِ محبت کی دلیل ہے کیونکہ جوش خود نقص کی دلیل ہے دیکھو ہنڈیا میں جب تک جوش رہتا ہے کچی ہے اور جب جوش کم ہوکر سکون ہوجاتا ہے اس وقت سمجھتے ہیں کہ ہنڈیا پک گئی اسی لئے انبیاء علیہم السلام اور کاملین میں کیفیات کا جوش کم ہوتا ہے اور متوسطین میں ان سے زیادہ اور چُھٹ بھیوں میں تو سب سے زیادہ جوش ہوتا ہے' مگر سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کامل ہیں تو ان کی محبت بھی سب سے کامل ہے حالانکہ وہاں جوش نہیں پس عورتوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی کے پرانی ہوجانے سے اگر مرد کا جوش کم ہوجائے تو یہ محبت کے کم ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے کہ محبت کامل ہوگئی ہے مگر رنگ بدل گیا ہے پہلے محبت وعشق کا رنگ تھا اب رحمت و ہمدردی کا رنگ ہے پہلے محبت تھی مگر کس قدر تکلف اور اجنبیت بھی تھی اب بالکل بے تکلفی ہے کہ ایک دوسرے کا ہمراز ودمساز اور راحت وغم کا شریک ہے گویا دو قالب ایک جان ہیں یہ نکتہ ہے مودت ورحمت دولفظوں کے اختیار کرنے میں' اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ کہ ''اس میں لوگوں کے لئے دلائل قدرت ہیں جو سوچ سے کام لیتے ہیں''۔

(۱) جب تعلق قوی ہوجاتا ہے تو جوش کم ہوجاتا ہے۔

معاملہ نکاح میں دلائل قدرتِ الٰہی

اس میں ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سے وجود صانع پر استدلال ہوتا ہے اس طرح کہ دیکھو عورت اور مرد دونوں انسان ہی ہیں مگر دونوں میں کس قدر تفاوت ہے کہ مرد کی خلقت اور بناوٹ جدا ہے مرد سے بچہ نہیں پیدا ہوسکتا عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے مرد کو مرد سے وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہوسکتا جو عورت سے حاصل ہوتا ہے تو ایک ہی نوع کے افراد میں ایسا تفاوت اور اس میں مصالح کی اس قدر رعایت بدون صانع حکیم کے نہیں ہوسکتی اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی صانع(۱) ضرور ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ پر استدلال

ایک اعرابی کہتا ہے(اَلْبَعْرَۃُ تَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ وَالْاَثَرُ یَدُلُّ عَلَی الْمَسِیْرِ فَالسَّمَآءُ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَالْاَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ کَیْفَ لَا یَدُلَّانِ عَلَی اللَّطِیْفِ الْخَبِیْرِ) کہ اونٹ کی مینگنی دیکھ کر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں سے کوئی اونٹ گیا ہے اور قدم کا نشان دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی گیا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

تو یہ بڑے بڑے ستاروں اور چاند سورج والا آسمان اور یہ کشادہ اور فراخ سڑکوں والی زمین اپنے صانع حکیم کے وجود پر کیونکر دلالت نہ کرے گی؟ ضرور کریگی۔ سبحان اللہ! ایک جاہل بدوی کیسی عجیب بات کہتا ہے کہ جب آثار

(۱) بنانے والا۔

مؤثر پر دلالت کرتے ہیں دھواں دیکھ کر تم کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں آگ ہے نشان قدم دیکھ کر یہ خبر ہوجاتی ہے کہ یہاں سے کوئی ضرور گیا ہے اور ایک نفیس عمارت دیکھ کر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ نشان قدم خود ہی بن گیا ہوگا یا یہ مکان خود ہی تیار ہوگیا ہوگا پھر حیرت ہے کہ اتنا بڑا آسمان اور یہ پہاڑ اور زمین دیکھ کر اور اس کے نظام اکمل کا مشاہدہ کرکے تم کو اس کے صانع کا علم نہ ہو اور یوں کہو کہ یہ خود ہی اپنی طبیعت سے بن گئے ہیں۔ اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا بلکہ ایک بدوی بھی اس خیال کو دلیل سے باطل کررہا ہے۔

مصنوعات کے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

جس سے معلوم ہوا کہ مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے اور قرآن میں جا بجا اسی فطری دلیل سے وجود اور توحید(۱) پر استدلال کیا گیا ہے چنانچہ اس مقام پر بھی اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں سے بیبیاں بنائی ہیں۔ اگر غور سے کام لو تو تمہارے لئے دلائل قدرت موجود ہیں۔ اور یہی وہ فطری امر ہے جو میثاق ﴿اَلَسْتُ﴾ میں قلوب کے اندر پیوست(۲) کیا گیا ہے اسی میثاق سے آپ کو یہی سبق پڑھایا گیا ہے۔

عہد ﴿اَلَسْتُ﴾ پر شبہ کا جواب

اور اس پر جو ایک شبہ مشہور ہے کیونکہ آجکل ہمارے دوستوں نے شبہات کا سبق بھی پڑھ لیا ہے کہ ہم کو تو یہ عہد یاد نہیں کہ کب اور کس وقت لیا گیا اور جب یاد نہیں تو اس عہد سے فائدہ ہی کیا ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی لیکن

(۱) اسی فطری دلیل سے اللہ کے وجود اور اس کے ایک ہونے پر پر استدلال کیا گیا ہے (۲) یہی وہ فطرت ہے جو میثاق ﴿اَلَسْتُ﴾ میں دلوں میں ڈالی گئی ہے۔

اس کا مقصود سب کو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے کیفیت تعلیم و تعلّم کا یاد رہنا مقصود نہیں۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے ان کو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنی آنا ہیں کیونکہ آمدنی کا سبق آج کل ہر شخص کو یاد ہے لیکن اگر آپ ان سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنی آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے اور ''آمد نامہ'' آپ نے کون سے استاد سے پڑھا ہے تو ان سوالات کا جواب شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے گا کیونکہ یہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں تو کیا ان کے یاد نہ رہنے سے یہ کہا جائیگا کہ آمد نامہ پڑھنا فضول اور بیکار گیا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ آمد نامہ پڑھنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے کیفیت تعلیم و تعلّم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق ﴿اَلَسْتُ﴾ سے مقصود یہ تھا کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہوجائے (۱) کیفیتِ تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا سو بحمداللہ وجود اور توحید صانع فطرۃً ہر شخص کے دل میں مرکوز ہے (۲) اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھ کر ایک جاہل بدوی بھی صانع (۳) کے وجود پر استدلال کرتا ہے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آمد نامہ کی جو تم نے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جس کو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے چنانچہ بعضے قوی الحافظہ اب بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہم نے آمد نامہ کس سے پڑھا تھا اور کس مکان میں پڑھا تھا مگر میثاق ﴿اَلَسْتُ﴾ کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کئی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔

ازل میں جو عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کہا گیا تھا اس کی کیفیت اور اثرات

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے یہاں بھی بعضے

(۱) اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا مضمون دل میں جم جائے (۲) دل میں جم چکی ہے (۳) اشیاء کو دیکھ کر ایک جاہل بھی ان کے بنانے والے کے وجود پر استدلال کر لیتا ہے۔

قوی الحافظ ایسے موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت اب تک یاد ہے چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں ؎

الست از ازل ہمچنان شان بگوش　　بفریاد قالوا بلٰی در خروش (۱)

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب بھی موجود ہیں اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم کو یاد ہے کہ اس وقت ہماری دائیں طرف فلاں اور بائیں طرف فلاں تھا۔

اور انہی بزرگ کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ارواح صف بستہ (۲) نہ تھیں بلکہ یوں ہی گڈ مڈ جمع تھیں جیسے میلہ میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اس وقت جو لوگ باہم رودررو (۳) ہوگئے ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رودر پشت (۴) ہوئے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت کی طرف تھا ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت (۵) ہوئے ان میں طرفین سے انقباض و اعراض ہوتا ہے اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا بھی محمل ہے ((اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ)) ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ جس وقت ازل میں میثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تکنے لگیں کہ جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم (سردار عالم فداہ آباؤ ناوامھاتنا) کی زبان مبارک سے بَلٰی نکلا تو آپ کے بعد سب نے بَلٰی کہا

(۱) ازل میں جو عہد الست لیا گیا تھا اس کی کیفیت میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہے قالوا بلٰی کی بازگشت میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہے (۲) ارواح صفیں باندھ کر نہیں کھڑی تھیں (۳) جن کے چہرے آمنے سامنے ہوئے (۴) ایک کا چہرہ دوسرے کی پیٹھ (۵) جن کی پشتیں (کمریں) ملی ہوئی تھی ان میں باہم نفرت ہوگئی۔

(صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ کما یحب و یرضی) تو حضرت آپ سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے اس امت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت یاد ہے۔

بلکہ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیائش تک کر آئے کہ جنت کتنی بڑی ہے اس کے کتنے درجے ہیں اسی طرح دوزخ کی تفصیلی سیر کی اور اس کی پیائش بھی کر لی اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ انہی بزرگ کو زمین آسمان سے باہر ایک سمندر بہت بڑا مکشوف ہوا ہے جس کی ایک موج اس غضب کی ہوتی ہے کہ اگر ملائکہ اس کو نہ روکیں تو آسمان و زمین کو غرق کر دے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مگر عرش سب سے بڑا ہے اس سے بڑی کوئی چیز نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ دلائل قدرت اور آثار خلق کو دیکھ کر خلاق عالم کی ہستی کا اقرار فطری امر ہے اس پر یہ گفتگو تبعاً آ گئی کہ فطرت میں یہ مضمون میثاق ﴿اَلَسْتُ﴾ کے وقت سے مرکوز ہوا ہے اور اس کے بیان میں اور شبہات کے جوابات میں کلام قدرے طویل ہو گیا بہر حال مصنوع کو دیکھ کر صانع پر استدلال فطری ہے گو اس کی فلسفی تقریر دقیق ہے جس کو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔

وجودِ صانع کی فلسفی دلیل

چنانچہ فلسفی طریقہ پر وجود صانع (۱) کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کے حدوث کا تو ہم کو مشاہدہ ہوتا ہے اور جن کے حدوث کا مشاہدہ نہیں ہوا انکے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر کا یعنی ماہر سائنس کا قول

(۱) اللہ کے وجود کی فلسفی دلیل۔

پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آ گئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہوکر یہ چراغ گل ہوجائیگا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال ہے تمام عالم فنا ہوجائیگا (ہم تو اس خبر سے خوش ہوئے اور اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا تو اب آلات رصد سے یقین آنے لگا ۱۲ظ) غرض اشیاء عالم کا تغیر وانقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں قدیم نہیں یعنی انکا وجود دائمی اور ضروری نہیں اور حادث کے لئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح(۱) کی ضرورت ہے کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم مساوی ہو یعنی نہ اس کے لئے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود وعدم برابر ہو تو اس کے وجود کے لئے کوئی مرجح ہونا چاہئے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئیگی اور ترجیح بلا مرجح باطل(۲) ہے پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائیگی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لئے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑیگا اور یہ ماننا پڑیگا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خالق عالم(۳) کہتے ہیں۔

فلاسفہ کے اشکال کا جواب

اس پر ایک سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا اور ایک حال میں پیدا نہیں کیا بلکہ کسی کو آج پیدا کیا کسی کو آج سے ہزار برس سو برس پہلے پیدا کیا اور کسی کو بعد میں پیدا کرے گا اور کسی کو حسین بنایا کسی کو بدشکل کسی کو مرد کسی کو عورت

(۱) کسی وجہ ترجیح کی ضرورت ہے (۲) بغیر کسی وجہ ترجیح کسی کو مقدم کسی کو مؤخر کرنا باطل ہے (۳) دنیا بنانے والا یعنی اللہ کہتے ہیں۔

کسی کو امیر کسی کو غریب کسی کو عاقل کسی کو احمق تو یہاں مرجح کون ہے۔ زید کو آج کیوں پیدا کیا کل کیوں نہیں کیا تھا اور اس کو امیر کیوں بنایا عمرو کی طرح غریب کیوں نہ بنایا زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی مثلاً۔

اس سوال کا جواب حکماء اسلام کے سوا کوئی نہیں دے سکا فلاسفہ کی عقلیں یہاں آکر چکر کھانے لگیں حکماء اسلام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادہ واجب مرجح ہے(۱) اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے اس کے لئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں۔

فلاسفہ کا دوسرا شبہ اور اُس کا جواب

اس پر حکماء یونان کی طرف سے ان کے معتقدوں نے یہ اشکال وارد کیا کہ بیشک یہ تو ہم نے مان لیا کہ ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم (۲) اور مراد حادث ہو اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔

اس کا جواب حکماء اسلام نے ایسا ہی دیا ہے کہ حکماء یونان کے دانت کھٹے ہو گئے فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں مگر انکا تعلق ممکنات کے ساتھ حادث ہے' اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے اس سے پہلے محال نہیں پس ہم یہ کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے اس لئے مراد کا وجود بھی مختلف از منہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی۔

بعض دلائل کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تو میں کہوں گا کہ اس کا

(۱) اللہ کا ارادہ اس ترجیح کا باعث ہے (۲) ارادہ تو ہمیشہ سے ہے اور اس کی مراد بعد میں ظاہر ہو۔

میرے پاس کچھ علاج نہیں میں تو جواب دے چکا اگر آپ کے پاس برتن نہ ہو اور کھانا گر جائے تو میں کیا کروں۔ اور اگر آپ یوں کہیں کہ اس کو ایسا آسان کر کے بیان کرو جو ہم بھی سمجھ جائیں تو میں کہوں گا کہ آپ ایک سائیس (۱) کو اقلیدس کی ایک شکل ایسے آسان طریقہ سے سمجھا دیجئے جس میں نہ اس کو اصول موضوعہ کے معلوم کرنے کی ضرورت ہو نہ معلوم متعارفہ کی نہ حدود کی نہ دوسری اشکال کی۔ صرف آپ کی تقریر ہی سے ایک مجلس میں اقلیدس کی شکل سمجھ جائے تو میں بھی آپ کو یہ تقریر آسان کر کے سمجھا دوں گا۔ اور اس مثال سے آپ بُرا نہ مانیں کہ ہم کو سائیس بنا دیا کیونکہ اول تو یہ لفظ عربی ہے' سیاست سے مشتق ہے سائیس کے معنی عربی میں سیاست داں ہیں اور سیاست دان ہونا تو تعریف کی بات ہے بُرا ماننے کی بات نہیں ہے آپ تو اپنے کو سیاست دان سمجھتے ہی ہیں تو میں نے سائیس کہہ دیا تو کیا بُرا ہوا۔

جواب سمجھنے کے لئے اہلیت شرط ہے

دوسرے یہ کہ میرا مقصود ہر بات میں آپ کو سائیس سے تشبیہ دینا نہیں بلکہ صرف اس بات میں تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح وہ اقلیدس کے اصول موضوعہ اور مبادی (۲) سے ناواقف ہے اس لئے اقلیدس کی شکلیں نہیں سمجھ سکتا اسی طرح چونکہ آپ دلائل عقلیہ کے اصول و مبادی سے ناواقف ہیں اس لئے اس تقریر کو آپ نہیں سمجھ سکتے گو کتنا ہی آسان کر کے بیان کیا جائے کیونکہ میں نے تو اس وقت بھی اردو ہی میں تقریر کی تھی عربی یا عبرانی میں تقریر نہ کی تھی مگر آپ کو اصول و مبادی حاضر نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھ سکتے اگر سمجھنا مطلوب ہے تو اول اصول و مبادی سے فراغت کر لیجئے پھر فوراً سمجھ میں آجائیگا۔

(۱) گھوڑے کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا (۲) جس طرح وہ اقلیدس کی ابتدائی تعلیم اور اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اقلیدس کی شکلوں کو نہیں سمجھ سکتا اسی طرح تم دین کے مبادیات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علماء کے پاس تو ہر بات کا جواب ہے مگر آپ کے پاس سوال ہی نہیں یعنی سوال کی اہلیت نہیں ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست (۱)

مرد و عورت کے نکاح میں آیات کثیرہ کا وجود

اب شاید کسی کو یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ خلق ازواج میں آیات کثیرہ کہاں ہیں؟ جو کہ ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیاتٍ ﴾ میں صیغہ جمع سے مفہوم ہو رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں میاں بیوی ہیں پس ہر فرد کا وجود اور ان کی باہمی مودت و رحمت الگ الگ دلیل ہے جو مجموعہ ہو کہ بہت سے دلائل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی میاں بیوی کو لیا جائے تو خود ان میں بھی بہت سے دلائل ہیں کیونکہ نکاح سے انسان کے لئے ایک نیا عالم شروع ہو جاتا ہے جو ہر شخص کی زندگی کا ورق الٹ دیتا ہے۔ یقیناً جس شخص نے کسی بچہ کو چار پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا وہ اس کو نکاح کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ گھر کا سردار بنا ہوا بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہے تو وہ ہرگز یہ نہ سمجھے گا کہ یہ وہی بچہ ہے جو میرے سامنے ننگا پھرا کرتا تھا یقیناً وہ اول اسکو دوسرا آدمی سمجھے گا پھر لوگوں کے بتلانے کے بعد جب یہ سنے گا کہ یہ وہی لڑکا ہے تو اس کو بڑی حیرت ہوگی کہ اللہ! کیا سے کیا ہو گیا' اور جس نے کسی شخص کو اس حال میں دیکھا ہو کہ آج اس کی شادی ہو رہی ہے پھر ایک عرصہ کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ خود اپنے لڑکے کا نکاح کر رہا ہے تو اس کو بڑی حیرت ہوگی یہ تو وہ باتیں ہیں جو دوسروں کو محسوس ہوتی ہیں اور خود اس شخص کو اگر وہ تامل سے کام لے نکاح کے بعد اپنی زندگی میں ایسا

(۱) یہ کیسا عاشق ہے کہ محبوب اس کی طرف نظر نہیں کر رہا اے خواجہ اس کے دل میں درد ہی نہیں ہے ورنہ طبیب ضرور اس کی طرف متوجہ ہوتا۔

انقلاب عظیم معلوم ہوگا کہ گویا یہ دوسری زندگی ہے۔

مسئلہ تجدد امثال

اور یہاں سے ایک مسئلہ کشفی کی تائید ہوتی ہے یعنی تجدد امثال کی جو صوفیاء کو کشف سے معلوم ہوا ہے کہ ہر شئے کے لئے ایک ہی وجود مستمر نہیں ہے بلکہ ہر آن میں پہلا وجود فنا ہو کر دوسرا وجود عطا ہوتا ہے مگر چونکہ تبدل وجود علی الاتصال والتوالی (۱) پے در پے ہوتا رہتا ہے اس لئے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی وجود بچپن سے اخیر عمر تک مستمر ہے حالانکہ یہ ایک وجود نہیں بلکہ اس پر ہزاروں لاکھوں وجود آئے ہیں جس کو اہل کشف مشاہدہ کرتے ہیں اسی کی ایک نظیر کو ایک عارف نے یوں بیان کیا ہے ؎

گشتگان خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگرست (۲)

اور یہی محمل ہوسکتا ہے اس شعر کا جو مولانا کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے ؎

ہفت و ہفتا و قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام (۳)

مگر یہ مسئلہ کشفی ہے اس پر اعتقاد لازم نہیں اور چونکہ نصوص اس سے ساکت ہیں (۴) نفی بھی نہیں کرتیں اس لئے صحت کا بھی احتمال ہے (اس وقت حضرت مولانا پر دھوپ آ گئی اس لئے کرسی کو ہٹانا پڑا تو فرمایا دیکھئے اونچا ہونے میں یہ خرابی ہے کہ ذرا سی دیر میں دھوپ سے سکنے لگے مگر یہ ثبوت نہیں محض تائید ہے ۱۲ ظ) یہ تو آیت کا مدلول تھا جو ترجمہ کے بعد بیان کر دیا گیا۔

(۱) انسان کے وجود میں تبدیلی لحہ بہ لحہ آتی رہتی ہے اسی لئے محسوس نہیں ہوتی اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے دن جو وجود ملا تھا وہی آج تک چل رہا ہے یہ غلط ہے بلکہ حقیقتاً سینکڑوں وجود عطاء ہوئے جن کو اہل کشف نے محسوس کیا (۲) تیرے خنجر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں کو غیب سے ہر زمانے میں نئی جان عطاء ہوتی ہے (۳) میں نے ستتر جسم دیکھے ہیں جیسے سبزہ کاٹنے کے بعد بار بار پیدا ہوتا رہتا ہے (۴) قرآن وحدیث اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔

تشبہ سے مقصود

اب میں بطور تشبیہ کے اس مضمون سے ایک اور مضمون کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تشبیہ اور نظیر سے تائید اور توضیح (۱) ہوجاتی ہے مثلاً کوئی تشبیہ کے طور پر یوں کہے کہ زید شیر ہے تو اس سے محض وضاحت اور تنویر مقصود ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعی شیر ہے۔ اسی طرح جو مضمون میں بیان کرونگا وہ مدلول آیت نہیں ہاں اس کی نظیر اور مثال ہے اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضرات صوفیاء پر جو بعض تفاسیر کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ قرآن کی نئی نئی تفسیریں کرتے ہیں یہ معترضین کی غلطی ہے۔

صوفیاء کی تفاسیر کی حقیقت

صوفیاء نے ان باتوں کو تفسیر کے طور ر بیان نہیں کیا بلکہ محض تنظیر وتشبیہ کے طور پر بیان کیا ہے اور صوفیاء کے معتقدین جو اس کو تفسیر سمجھتے ہیں وہ بھی غلطی کرتے ہیں مثلاً ﴿ اِذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ (۲) کے تحت میں صوفیاء نے لکھا ہے اِذْهَبْ يَارُوْحُ اِلَى النَّفْسِ فَجَاهِدْهَا اِنَّهَا قَدْ طَغَتْ کہ ''اے روح نفس کی طرف جا اور اس سے جہاد کر کے اس کو مغلوب کر کہ وہ حد سے نکلا جارہا ہے'' بعض ناواقفوں نے اس کو تفسیر سمجھ لیا پھر ان میں جو معتقد تھے وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون علیہ اللعنۃ (۳) کا قصہ مذکور ہی نہیں ہے بلکہ موسیٰ سے مراد روح ہے اور فرعون سے مراد نفس ۔ مگر یہ سراسر جہل ہے واللہ صوفیاء کی یہ مراد ہرگز نہیں اور جو ان کی طرف یہ بات منسوب کرے وہ جھوٹا ہے اور بخدا قرآن میں موسیٰ وفرعون

(۱) تائید اور وضاحت ہوجاتی ہے (۲) ''تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے'' سورۂ طٰہٰ: ۲۴
(۳) فرعون پر اللہ کی لعنت ہو۔

سے روح و نفس ہرگز مراد نہیں بلکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام ہی کا قصہ فرعون کے ساتھ مراد ہے جو کہ ظاہری مدلول ہے ورنہ اگر ظاہری مدلول مراد نہ ہو تو پھر قرآن سے نماز روزہ حج زکوۃ وغیرہ کچھ ثابت نہ ہو سکے گا۔

ملحدین کے قول کی تردید

اور یہ وہی بات ہوگی جو ملحدین نے کہی ہے اور صوفیاء ملحد نہ تھے وہ الحاد سے بالکل بری تھے۔ بعض ملحدین نے یہ دعوی کیا ہے کہ قرآن میں صلوۃ سے مراد نماز شرعی نہیں بلکہ روح صلوۃ مراد ہے یعنی تعلق مع اللہ اسی طرح زکوۃ سے مراد زکوۃ شرعی نہیں بلکہ اس سے روح مراد ہے یعنی سخائے نفس اسی طرح تمام نصوص میں تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ اعمال کا ایک ظاہر ہے ایک باطن علماء نے قرآن کو ظاہر پر محمول کیا ہے ہم اس کو باطن پر محمول کرتے ہیں اور ان لوگوں نے مولانا رومی کا ایک قول اپنی دلیل میں بیان کیا ہے ؎

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں عاشقان ہم فی صلوٰۃ دائموں

کہ دیکھو مولانا فرماتے ہیں کہ عوام تو پانچ ہی وقت نماز پڑھتے ہیں اور عشاق ہمیشہ نماز ہی میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ صلوٰۃ شرعیہ کا تحقق دائما نہیں ہوسکتا کیونکہ اکل و شرب و بول و براز اور سونے کی حالت میں نماز ظاہری نہیں ہوسکتی تو وہ کونسی نماز ہے جس میں عشاق دائماً مشغول رہتے ہیں وہ روح نماز ہی تو ہے یعنی تعلق و حضور مع اللہ جو کسی وقت ان کے دل سے جدا نہیں ہوتا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا صحیح مطلب

میں کہتا ہوں کہ مولانا کے کلام سے یہ ثابت نہیں ہوتی کہ عشاق ظاہری

نماز ادا نہیں کرتے بلکہ مولانا کے کلام کے معنی عشاق کے لئے دو نمازوں کا ثابت کرنا ہے پس انہوں نے اول یہ فرمایا ہے کہ عوام تو پانچ ہی وقت نماز پڑھتے ہیں اس کے بعد عشاق کی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ وہ ہر وقت نماز میں رہتے ہیں اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان پانچوں کو بھی ادا کرتے ہیں اور ان ہی پانچ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر دم نماز میں رہتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ مولانا نے عشاق سے نماز ظاہری کی نفی کی ہے ان کے کلام کی تحریف ہے بلکہ مولانا نے اس کے ساتھ عشاق کے لئے ایک زائد بات بیان فرمائی ہے جس کی وجہ سے ان کے لئے دائما مشغولی صلوٰۃ(۱) ثابت ہو رہی ہے اور وہ زائد بات کیا ہے وہ نماز کا شوق اور انتظار ہے مطلب یہ ہے کہ عوام تو نماز پڑھ کر اس سے غافل ہو جاتے ہیں اور عشاق نماز کے بعد دوسری نماز کی فکر و انتظار میں بے تاب رہتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ ''نماز کے انتظار میں لگا رہنے والا نماز ہی میں ہے'' اس لئے عشاق ہر وقت نماز میں ہیں یعنی ان کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا رہتا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ عشاق کی نماز دوسری ہے اور وہ پانچ وقت کی نمازیں نہیں پڑھتے۔ یہ تو مولانا کے کلام سے استدلال کا جواب تھا۔

روح عمل کا تحقق بدون ظاہر کے نہیں ہوسکتا' اس کی مثال

رہا اُن کا یہ کہنا کہ اعمال کے لئے ایک ظاہر ہے ایک باطن یہ مسلّم ہے لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ اعمال کی صورت اور ظاہر مطلوب نہیں دیکھو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے آپ کے بیٹے کا ایک ظاہر ہے یعنی قالب(۲) اور ایک باطن

(۱) ہمیشہ نماز میں مشغول رہنا ثابت ہو رہا ہے (۲) جسم۔

ہے یعنی روح' کیونکہ انسان صرف ظاہر سے انسان نہیں بلکہ اپنی روح کے ساتھ انسان ہے اگر روح نہ ہو تو یہ قالب مٹی میں دفن کرنے کے قابل سے لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف روح ہی مطلوب ہے اور قالب بالکل مطلوب نہیں اگر یہ ہے تو پھر اپنے بیوی بچوں کو گلا گھونٹ کے مار دو کیونکہ روح تو پھر بھی رہے گی اس کو تو گلا گھونٹنے سے موت نہ آئے گی صرف قالب کو موت آئے گی تو کیا حرج ہے یہ تو مطلوب ہی نہیں۔ اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ مطلوب تو روح ہی ہے اور قالب مطلوب نہیں مگر چونکہ یہ روح ہمارے پاس بدون اس قالب کے نہیں رہ سکتی اس لئے بدن بھی مطلوب ہے جزاک اللہ بس یہی ہم کہتے ہیں کہ جس چیز کو آپ روح صلوٰۃ کہتے ہیں وہ روح آپ کو بدون نماز کی اس صورت وقالب کے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی وہ روح اسی صورت کے ساتھ لگی ہوئی ہے اگر اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس صورت کو لازم پکڑو ورنہ بدون اس کے جو شخص روح صلوٰۃ کے حصول کا مدعی ہو وہ یقیناً جھوٹا ہے یہ نو معتقدوں کی حالت تھی کہ انہوں نے صوفیاء کے ان اقوال کو تفسیر سمجھ لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ مقصود صرف باطن ہی ہے ظاہر مراد ہی نہیں' اور جو لوگ ان کے معتقد نہ تھے وہ ان پر فتویٰ لگانے لگے کہ صوفیاء ملحد ہیں کہ قرآن کے اندر تحریف کرتے ہیں آیات کی تفسیر بالرائے کرتے ہیں یہ ہی غلطی پر ہیں۔

صوفیاء کی تفاسیر کا مقصود

اور جو سچے معتقد اور محقق تھے انہوں نے یہ کہا کہ صوفیاء کی مراد تفسیر کرنا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے قرآن پڑھنے والے تو قرآن کے قصوں کو محض قصہ سمجھ کر نہ پڑھ بلکہ ان سے سبق حاصل کر کیونکہ قرآن میں جو قصے مذکور ہیں وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں جیسا خود قرآن میں ارشاد ہے

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾(۱) پس جب تو موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو اس سے یہ سبق حاصل کر کہ تیرے اندر بھی ایک چیز موسیٰ کے اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی روح اور نفس دوسری عبارت میں یوں سمجھو کہ انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک داعی الی الخیر(۲) جو مشابہ موسیٰ علیہ السلام کے ہے دوسری داعی الی الشر(۳) جو مشابہ فرعون ملعون کے ہے پس تو بھی اپنی روح کو نفس پر غالب کر جس کا طریقہ مجاہدہ اور تبلیغ ہے پس تو نفس کو آیات الٰہیہ یاد دلا تا کہ اُس کو خوف الٰہی پیدا اور نافرمانی سے باز آجاوے یہ علم اعتبار ہے کہ دوسرے کے قصہ کو اپنی حالت پر منطبق کر کے سبق حاصل کیا جائے پس اس آیت سے روح و نفس کی حالت پر حکم کرنا استدلال کے طور پر نہیں بلکہ بطور اعتبار کے ہے۔

علم استدلال اور علم اعتبار کی تحقیق

استدلال تو مفہوم لغوی سے ہوتا ہے ان طرق کے ساتھ جو اہل معانی واصول نے بیان کئے ہیں اور اعتبار تشبیہ و اشارہ کے طور پر ہوتا ہے اور ان دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن میں دلیل و استدلال کا لفظ صراحۃً نہیں آیا بلکہ اس کے مرادفات آتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾(۴) اور ﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ﴾(۵) چونکہ برہان اور علم دلیل کے معنی میں ہیں اس لئے اس کا نام استدلال رکھنا صحیح ہو گیا جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے معنی میں یوں کہنا کہ حق تعالیٰ نے نماز کو فرض کیا ہے صحیح ہے حالانکہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں اللہ اور

(۱) ''ان کے قصہ میں سمجھ دار لوگوں کے لئے عبرت ہے یہ قرآن کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں ہو چکی ہیں یہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر بات کی تفصیل کرنے والا ہے ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے'' سورۂ یوسف:۱۱۱ (۲) ایک خیر کی طرف بلانے والی (۳) دوسری شر کی طرف بلانے والی (۴) ''آپ کہیے تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو'' سورۂ نمل:۶۴ (۵) ''آپ کہیئے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے'' سورۂ انعام:۱۴۸۔

فرض کا لفظ صراحۃً نہیں مگر اس کا قائم مقام موجود ہے۔ اور دوسرے طریق کا نام خود قرآن ہی میں اعتبار آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے ﴿ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ ﴾(۱) اس سے اوپر بنی نضیر کے (جو یہود کا ایک قبیلہ ہے) جلاوطن کئے جانے کا قصہ مذکور ہے جس کے بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ ''اے بصیرت والو اس سے عبرت حاصل کرو'' یعنی اگر تم ایسی حرکت کرو گے جو ان لوگوں کی ہے تو اپنے واسطے بھی اس عذاب کو تیار سمجھو اور یہی تو علم اعتبار ہے کہ دو چیزوں میں مشابہت ہو تو ایک نظیر سے دوسری نظیر کا استحضار کیا جائے اور یہی عبرت حاصل کرنے کے معنی ہیں کہ دوسرے کی حالت کو اپنے اوپر منطبق کیا جائے کہ اگر ہم نے اس کے جیسے اعمال کئے تو ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو اس کا ہوا ہے۔

صوفیاء کے علم اعتبار کے استعمال کے شواہد

رہا یہ سوال کہ جس طرح صوفیاء نے علم اعتبار کا استعمال کیا ہے کیا نصوص میں بھی ایسا استعمال آیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ بحمداللہ اس کی نظیر نصوص میں بھی موجود ہے۔ اور میں یہ بات خود نہیں کہتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے میں اس کا ثبوت دیتا ہوں اور وہ اتنے بڑے محقق ہیں کہ بعض لوگوں نے اُن کو غیر مقلد سمجھ لیا ہے کہ وہ ائمہ کی تقلید بھی نہ کرتے تھے مگر یہ غلط ہے وہ مقلد ہی ہیں مگر مقلد محقق ہیں لکیر کے فقیر نہیں جیسے سالکین و مجذوبین کے سلوک و جذب میں مراتب ہیں کہ بعض سالک مجذوب ہیں بعض مجذوب سالک ہیں بعض سالک محض ہیں بعض مجذوب محض ہیں ایسے ہی تقلید و تحقیق کے بھی مراتب ہیں کہ بعض مقلد محض ہیں بعض محقق محض یعنی مجتہد ہیں اور بعض مقلد محقق ہیں بعض محقق مقلد ہیں۔

(۱) ''سو اے دانشمندو! عبرت حاصل کرو'' سورۂ حشر: ۲۔

تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقلد محض نہ تھے بلکہ مقلد محقق تھے اسی لئے بعض کو اُن پر غیر مقلدی کا شبہ ہوا تو اتنے بڑے محقق نے دو حدیثوں کے متعلق ''فوز الکبیر'' میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تقدیر کا مسئلہ ارشاد فرمایا ((مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ لَهُ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ)) یعنی ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں یا دوزخ میں پہلے ہی سے لکھدیا گیا ہے۔ اس پر حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر عمل کی کیا ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُصِيْرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاءِ فَسَيُصِيْرُ لِعَمَلِ الشَّقَاءِ ثُمَّ قَرَأَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى)) متفق علیہ کہ عمل کرتے رہو ہر شخص کے لئے وہ عمل آسان کردیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص اہل سعادت سے ہوگا اس کے لئے عمل سعادت آسان ہوگا اور جو اہل شقاوت سے ہوگا اس کے لئے عمل شقاوت آسان ہوگا اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴾[1] (کہ جو شخص (اللہ کی راہ میں) صدقہ دے اور تقویٰ اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تصدیق کرے تو ہم اس کے لئے راحت کی چیز (یعنی جنت) کا سامان کردینگے اور جو بخل کرے اور بے پروائی اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تکذیب کرے ہم اس کے لئے تکلیف کی چیز (یعنی جہنم) کا سامان کردینگے ۱۲ اظ)

(۱) سورۂ لیل قال الشیخ مقابلة الاستغناء بالتقوی یشعربان المراد الاستغفار عدم المبالاة والغفلة ففیه دلالة ان الغنی المذموم هوماکان مع الغفلة وعدم المبالاة وان التقویٰ حقیقة الفکرفان المقابل للاستغفار هوالتقویٰ بهذا المعنی ۱۲ظفراحمد وبهذا سهل تفسیر قوله تعالیٰ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ای الذین هم فی فکرو خشیة ویتاید هذا التفسیر باللغة فان التقویٰ لغة الخوف والخدر ۱۲ اشرف علی

اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقدیر کا ذکر کہاں ہے آیت کا مدلول تو یہ ہے کہ اعطاء وتقویٰ سے جنت آسان ہوجاتی ہے اور بخل واستغفار سے دوزخ آسان ہوجاتی ہے اس کا جواب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور علم اعتبار (۱) کے اس آیت کے مضمون سے حدیث کے مضمون پر استشہاد فرمایا ہے اور مقصود تشبیہ دینا ہے کہ جیسے بواسطہ اعمال کے بعض کے لئے جنت اور بعض کے لئے معاصی کو آسان کردیا ہے اور یہ تشبیہ محض توضیح کے لئے ہے کہ تقدیر سے تیسیر ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسی اس آیت میں تیسیر اعمال سے مذکور ہے پس مقصود تشبیہ سے توضیح ہے مشبہ کی اسی لئے تشبیہ میں شرط ہے کہ مشبہ بہ میں وہ صفت اوضح واشہر ہو گو اقوی بہ ہو۔

شبہ کا جواب

اب یہاں سے تشبیہ کے متعلق ایک مشہور سوال کا بھی حل ہوگیا وہ یہ کہ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ) میں جو صلوۃ علی رسول اللہ نبینا صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کو صلوۃ علیٰ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے صلوٰۃ ابراہیمیہ کے افضل واکمل ہونے کا صلوۃ محمدیہ سے اور منشا اس کا وہی ہے کہ

(۱) قلت ولا یخفی ما فی ھذا الجواب من البعد والاسھل فی التوجیہ ان یقال فی معنی الآیۃ ان ﴿مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾ فھوالذی اردنا بہ التیسیر للیسری ﴿مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی﴾ فھو ممن اردنا بہ التیسیر للعسری وھذا راجع الی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ((اعملوا فکل میسر لما خلق لا ای وعلمہ علامۃ لماکتب لہ من السعادۃ والشقاوۃ)) وھذا ھوالظاھر من الآیۃ لاان الاعطاء والتقوی موثر فی تیسیر الیسری اوالبخل والاستغفار فی عکسہ بل کل ذلک امارات وعلامات لما ارادالله به و قدرله من قبل والمیسر ھواللہ تعالیٰ واللہ اعلم ۱۲ظفراحمد۔

لیس المقصود ترجیح توجیہ علی توجیہ بل المقصود اثبات ان العلماء الراسخین حکموا بکون علم الاعتبار من القرآن ویبعد ان یحکو اباالباطل ۔ ۱۲اشرف علی۔

عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ(۱) کا مشبہ (۲) سے اقوی وافضل (۳) ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے بلکہ صرف اوضح واشہر ہونا ضروری(۴) ہے افضل واکمل ہونا ضروری نہیں۔

مشبہ بہ کا افضل ہونا ضروری نہیں اوضح ہونا ضروری ہے

اوراس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ (۵) اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح (۶) کے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ نور مصباح (۷) لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے۔

چاند اور سورج کے نور سے کیوں تشبیہ نہیں دی

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن تو نور شمس وقمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو اس کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقوی ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی اس کی ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور ہی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوتی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس ہے(۸) تو اس کی ساتھ تشبیہ دینے میں اس

(۱) جس کو تشبیہ دی جائے (۲) جس سے تشبیہ دی جائے (۳) زیادہ قوی اور زیادہ افضل ہونا (۴) زیادہ واضح اور زیادہ مشہور ہونا ضروری (۵) سورۂ نور: ۳۵ (۶) واضح ہونے کی وجہ سے (۷) چراغ کا نور (۸) چاند کا نور سورج کے نور سے حاصل ہوتا ہے' اسپر اشکال یہ ہوتا ہے کہ نور قمر کا مستفاد من الشمس ہونا تو اہل علم ہی میں مشہور ہے اور چراغ کے نور کا مستفاد ہونا دیا سلائی یا چقماق کی آگ سے ہر شخص کو مشاہد ہے اور خود نص میں اس کا ذکر ہے ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾ میں پس میرے خیال میں نور قمر سے تشبیہ نہ دینے کی توجیہ یہ کی جائے تو اچھا ہے کہ قمر میں کچھ عیب ہے کہ کبھی ہلال ہے کبھی بدر کامل ہے کمال کے بعد زوال ہے ولیس نور اللہ کذلك ''اللہ تعالیٰ کا نور ایسا نہیں ہوسکتا'' نیز اصل سوال کا جواب سہل یہ ہے کہ نور شمس وقمر دونوں میں یہ نقص ⇦

بات کا شبہ ہوتا کہ نورِ حق بھی کسی سے مستفاد ہے۔

چراغ کے نور اور چاند سورج کے نور میں فرق

پھر چراغ میں ایک صفت شمس وقمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منوَّر و منوّر بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس وقمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے (اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہوجاتا ہے اور درودیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ نورِ حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے ۱۲ ظ) مگر یہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں کہ اس سے کوئی نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے مطلب صرف یہ ہے کہ نورِ حق دوسروں کو منوَّر بھی کرتا ہے اور منوّر بھی گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس وقمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں ہر شے کو اپنی حد پر

⇦ ہے کہ اس سے روشنی حاصل کرنے میں کسی کے کسب وطلب واختیار کو دخل نہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور سے استفادہ کرنے میں کسب وطلب وعمل کو دخل ہے کہ جو کوئی اپنے قلب کو مثل زجاجہ کوکب دری کی طرح صاف و شفاف کرلے اور اس میں ذکراللہ وعشق اور اخلاق کا زیت مبارک بھرلے تو نورِ حق سے مستفید و منور ہوجائیگا ورنہ نہیں پس اس کی مثال نور مصباح ہی سے بہتر ہے جس سے استفادہ وتنور باختیار وطلب عبد ہے نہ بالاضطرار علاوہ ازیں یہ کہ نور شمس وقمر گو اقوی ہے مگر اس کی طرف انسان کی احتیاج اس قدر حاضر فی الذہن نہیں جس قدر نور مصباح کی احتیاج حاضر فی الذہن ہے کیونکہ شمس وقمر کا طلوع وغروب عادت کے موافق خود ہوتا رہتا ہے بہت سے آدمیوں کو اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور نور مصباح کی ضرورت کی طرف ہر ایک کو التفات ہوتا ہے۔ رات کے وقت ہر شخص کو اس کی طلب ہوتی اور اس کی طرف التفات بھی ہوتا ہے ھـــذا ماعندی و کل ذلك من قبیل النكات ولعل هذا احسن والله تعالیٰ اعلم ۱۲ ظفر احمد۔

رکھنا چاہئے۔ اور چونکہ یہ نکات ہیں اس لئے علماء سے ان کے پوچھنے کا بھی کسی کو حق نہیں۔ اگر وہ خود بتلادیں تو ان کا احسان ہے یہ چٹنی مربہ ہے اور دعوت پلاؤ زردہ کی ہوتی ہے چٹنی مربے کی دعوت نہیں ہوتی وہ تو غذا کو لذیذ بنانے کے لئے ہے خود مقصود نہیں۔

یہ تفضیل آیت کی تفسیر میں تھی جو استطراداً مذکور ہوگئی مجھے اس آیت کے ذکر سے صرف یہ مقصود تھا کہ اس میں نورِ حق کو نور مصباح سے تشبیہ دی گئی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ نورِ مصباح کو نورِ حق سے کچھ نسبت نہیں پس ثابت ہوگیا کہ مشبہ کے لئے مشتبہ بہ کا مشبہ سے اقوی ہونا لازم نہیں صرف اوضح واشہر ہونا شرط ہے۔

حضور ﷺ پر درود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درود کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ

پس درود شریف میں بھی جو صلوٰۃِ محمدیہ کو صلوٰۃِ ابراہیمیہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس کی بنا بھی اسی پر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر خاص رحمت وصلوۃ کا نازل ہونا اہل ادیان میں مشہور تھا پس اس تشبیہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ صلوٰۃ ابراہیمیہ صلوٰۃ محمدیہ سے افضل واکمل ہو۔ بہرحال شاہ صاحب نے حدیث کی شرح میں علم اعتبار کی اصل قرآن سے بتلائی ہے ایک حدیث تو یہ تھی جس کے متعلق بیان ہو چکا۔

علمِ اعتبار کے استعمال کا حدیث سے ثبوت

دوسری حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ اعمال جو لوگ کر رہے ہیں پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں کہ کون کیا کریگا یا ہر شخص ابتداءً عمل کرتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا

((لَا بَلْ شَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْھِمْ وَمَضٰی فِیْھِمْ وَتَصْدِیْقُ ذٰلِكَ فِی کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا)) کہ نہیں بلکہ وہ یہ اعمال ہیں جو ان کے لئے پہلے ہی سے مقدر ہو چکے ہیں یہی وہ بات ہے جس کو ایک حدیث میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے: ((جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ)) میں اس وقت تقدیر کا مسئلہ بیان نہیں کرتا تا کہ شبہات کا جواب دوں ممکن ہے اس وقت کسی کے ذہن میں یہ سوال آیا ہو کہ جب سارے اعمال پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں تو پھر عمل صالح میں سعی کی کیا ضرورت ہے جو مقدر ہوگا ہو جائیگا یا یہ شبہ آیا ہو کہ جب پہلے سے سب کچھ مقدر ہو چکا ہے تو پھر کافر و فاجر کا کیا قصور ہے میں اس وقت چونکہ مسئلہ تقدیر کو حل نہیں کر رہا اس لئے ان شبہات کا جواب دینے کی مجھے ضرورت نہیں ہے (جس کو شوق ہو وہ اس بحث کو تفسیر بیان القرآن کے شروع میں ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ کی تفسیر میں دیکھ لے)

مسئلہ تقدیر کی وضاحت

ہاں اس وقت ایک بات کہتا ہوں جو مقنع ہے (یعنی اس سے صاحب انصاف کو تسلی ہو جائیگی گو بحث کرنے والا ساکت نہ ہو) وہ یہ کہ اگر خدا تعالیٰ کے سامنے یہ جواب کافی ہے کہ ہم سے جو گناہ صادر ہوئے ہیں تو ہم کیا کرتے آپ نے مقدر میں بھی لکھ دیا تھا' تو یہ جواب آپ کے غلام اور نوکر اور اولاد کی نافرمانی کے وقت یہی آپ کے مقابلہ میں کافی ہونا چاہئے جب غلام یا نوکر آپ کی نافرمانی کرے یا اُس کے ہاتھ سے کوئی نقصان ہو جائے تو اس کو سزا ہرگز نہ دیا کرو بلکہ تقدیر کو کافی جواب سمجھا کرو کہ غریب معذور ہے اس کی تقدیر میں یہی عمل تھا۔ اسی

طرح اولاد اگر تعلیم حاصل نہ کرے لڑکا اسکول سے بھاگتا ہو تو اس کو تنبیہ نہ کیا کرو بس صبر کرلو کہ اس کی تقدیر میں یہی ہے یہ کیا بات کہ یہاں تو باوجود اعتقاد تقدیر کے آپ کو صبر نہیں آتا بلکہ یوں پوری تدبیر سے کام لیتے ہو بچہ کو سزا دیتے ہو لالچ بھی دیتے ہو جب کوشش کرتے کرتے تھک گئے اس وقت تقدیر پر صبر وشکر کرکے بیٹھتے ہو اور خدا کے سامنے عذر تقدیر کو کافی جواب سمجھتے ہو اگر تقدیر پر بھروسہ کرکے دین کے اعمال سے بےفکری اختیار کی جاتی ہے اور اپنے کو بدعملی میں بےقصور سمجھا جاتا ہے تو دنیا کے کاموں میں بھی تدبیر کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اپنے ماتحتوں پر کسی غلطی کی وجہ سے گرفت نہ کرنا چاہئے ان کو بھی بےخطا بےقصور سمجھنا چاہئے۔

صاحبو! اس طریقہ کو چھوڑو تم خدا تعالیٰ پر ہرگز الزام قائم نہیں کرسکتے بخدا وہ ہر مجرم شخص کو لاجواب اور قائل کرکے سزا دینگے کسی کو ایسے حال میں سزا نہ دیجائے گی کہ وہ اپنے کو بےقصور سمجھتا ہو۔

باتوں سے کام نہ چلے گا عمل سے کام چلے گا

پس تم باتیں نہ بناؤ باتوں سے کام نہ چلے گا عمل ہی سے کام چلے گا۔ ارے اگر کسی کے لئے پھانسی کا حکم ہوگیا ہو تو اُس کو بجائے پھانسی کی علت کی تحقیق کے اور اس علت میں شبہات کے (۱) مراحم خسروانہ کی تفتیش وتلاش کرنا چاہئیے اس سے تو کچھ کام چلے گا پھانسی کی علت کی تحقیق سے کیا کام چل سکتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا عجیب مکالمہ

مشہور ہے کہ افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں اور آسمان کمان ہو اور تیرانداز حق تعالیٰ ہوں تو بچنے کی کیا صورت ہے۔

(۱) پھانسی کے حکم کی وجہ کی تحقیق اور اس میں شبہات نکالنے کے بجائے رحم کی اپیل کرنی چاہئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کھڑا ہو پھر تیر سے بچا رہیگا کیونکہ تیر اسی کو ہلاک کرتا ہے جو اس کی زد پر ہو اور جو تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہو اس پر تیر نہیں پہنچتا۔ سبحان اللہ! عجیب جواب ہے جس کو سن کر افلاطون نے اقرار کیا کہ یہ جواب نبی کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔

شبہات کا علاج اور اس کا طریقہ

صاحبو! پس تدبیر و تقدیر کے مسئلہ میں گفتگو نہ کرو بلکہ حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو یہ وساوس و شبہات جب ہی تک ہیں جب تک خدا سے تعلق نہیں اور تم عقل کے تابع ہو اس عقل کو فنا کرو خدا کی محبت اور انکا قرب حاصل کرو ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را (۱)

اور خدا تعالیٰ کی محبت حاصل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خودرائی چھوڑ کر اپنے کو کسی صاحب محبت کے حوالہ کردو ؎

قال را بگذارد مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو(۲)
سال ہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش
در بہاراں کے شود سر سبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ (۳)

تم اپنی عقل پر ناز نہ کرو کیونکہ اہل اللہ کے سامنے تمہاری عقل ایک طفل مکتب سے بھی کم ہے، بس اب تو عقل اس کو سمجھتے ہیں کہ چار پیسے کمانے کے قابل ہو گئے۔ بی۔ اے، ایم۔ اے ہو گئے حالانکہ عقل وہ ہے جو خدا کو پہنچانے جو اہل اللہ

(۱) دور اندیش عقل کو بارہا آزمالیا آخر کار بزرگوں کے اتباع ہی میں خیر پائی (۲) باتیں بنانی چھوڑو اپنے اعمال درست کرو کسی کامل شیخ کے سامنے اپنے کو مٹادو (۳) سالہا سال تم پتھر کی طرح سخت دل رہے آزمائش ہی کے لئے تھوڑی دیر کے لئے زمین کی صفت یعنی تواضع اختیار کرلو اس لئے کہ بہار کے موسم میں بھی پتھر پر سبزہ نہیں اگتا مٹی کی صفت اختیار کرو کہ تم میں سے رنگا رنگ پھول نکلیں۔

کو عطا ہوئی ہے پس ان کے سامنے اپنی عقل پر ناز کرنا ایسا ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

ناز راروے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بد خوئی مگرد (۱)

جب تم کو یہ عقل حاصل نہیں تو اہل اللہ کے سامنے اپنی دنیوی عقل پر ناز نہ کرو ؎

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو او باگریہ و آشوب باش (۲)
عیب باشد چشم نا بیناؤ باز زشت باشد روی نازیبا و ناز
پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیازد آہ یعقوبی مکن
آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را (۳)

تم اپنے کو جاہل مطلق سمجھ کر کسی محقق کے سپرد کردو اس وقت تعلق مع اللہ کی دولت حاصل ہوگی پھر تعلق مع اللہ اور محبت باللہ کے بعد ان شبہات و اعتراضات کا یہ حال ہوگا۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ ولا باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت (۴)

(۱) ناز کرنے کے لئے بھی منہ ہونا چاہئے گلاب جیسا جیسے اظہار درد کے لئے جب تمہارے پاس وہ چہرہ ہی نہیں تو زبان نہ چلاؤ (۲) جب تم یوسف نہیں بن سکتے تو یعقوب ہی کی صفت اختیار کرلو کہ انہوں نے رورو کر آنکھیں ضائع کرلیں (۳) عیب کی بات ہے کہ نابینا آنکھ ہو اور وہ کھلی ہوئی ہو، بری بات ہے کہ بدنما چہرہ ہو اور پھر آدمی ناز کرے، یوسف کے سامنے بڑائی اور خوبی ظاہر نہ کر یعقوب علیہ السلام کی نیاز مندی اور ان کے سواہ کچھ مت کر، اپنی دور اندیش عقل کو میں نے بہت آزمالیا اور آزمانے کے بعد اپنے کو دیوانہ بنا کر بیٹھ گیا ہوں (۴) عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو معشوق کے سوا سب کو جلا کر خاک کر دیتا ہے لا الہ الا اللہ پڑھتے وقت ''لا'' کی تلوار سے حق کے علاوہ سب کو قتل کرو پھر دیکھو کے لا کے بعد کیا بچا صرف الا اللہ یعنی اللہ رہ جائے گا باقی سب تمہارے دل سے نکل جائیں گے مبارک ہو اے عشق کہ تیری وجہ سے شرک سے محفوظ رہا۔

تعلق مع اللہ کے بعد سب وساوس خود ہی چلے جائیں گے اسی لئے مولانا جوش میں آکر ایک مقام پر عشق کی زور وشور سے مدح فرماتے ہیں

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما(۱)

اور اگر یہ حاصل نہیں تو یاد رکھو کہ ان باتوں سے اور دلیلوں سے کچھ کام نہ چلے گا میں علماء سے یہی کہتا ہوں کہ آپ کی یہ تقریریں اور نکات واسرار سب رکھے رہ جائیں گے اور سالکین سے بھی کہتا ہوں کہ یہ مواجید واذواق اور معارف وحقائق بدون تعلق صادق کے سب بیکار ہیں۔ حضرت نوکر کا فیشن کام نہیں آتا وہ بناٹھنا رہے اور باتیں بنایا کرے بلکہ اس کی خدمت کام آتی ہے۔

کام کی چیز

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کی ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا: کہ ساری عبادتیں اور اسرار ونکات و اشارات غائب ہوگئے ان سے کچھ کام نہ چلا بس وہ چھوٹی چھوٹی چند رکعتیں کام آئیں جو آدھی رات میں پڑھ لیا کرتے تھے۔

صاحبو! بڑی چیز یہ ہے کہ انسان اہل عمل اور مقصود کو لازم سمجھے اگر مقصود کے ساتھ غیر مقصود بھی حاصل ہوجائے تو نور علی نور ہے ورنہ کچھ نفع نہیں اگر مقصود حاصل نہ ہوا۔

---

(۱) اے عشق تجھے مبارک ہو تو ہمارا اچھا جنون ہے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب ہمارے غرور وتکبر کی دوا اے ہمارے افلاطون وجالینوس۔

آج کل غضب یہ ہے کہ علماء وصوفیاء سب غیر مقصود کے درپے ہیں۔ مقصود سے اکثر لوگ غافل ہیں بلکہ کوسوں دور ہیں۔

معرفتِ نفس وسیلہ ہے معرفتِ رب کا

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت مجھے تقدیر کے مسئلہ کا بیان کرنا مقصود نہیں تا کہ اُن شبہات کا جواب دوں جو اس مسئلہ پر وارد ہوتے ہیں بلکہ اس وقت تقدیر کا ذکر اس سلسلہ میں آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسئلہ کے ذکر میں بھی علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے یعنی حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((اَنْتُمْ فِیْ عَمَلٍ قَدْ فَرَغَ مِنْهُ وَتَصْدِیْقُ ذٰلِكَ فِی كِتَابِ اللّٰهِ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا)) کہ جو اعمال تم کر رہے ہو یہ وہ ہیں جن سے فراغت ہو چکی ہے یعنی سب پہلے ہی مقدر ہو چکے ہیں اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾ قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو پیدا کیا ﴿مَا﴾ بمعنی ''من'' ہے اور یہاں نفس کے ساتھ قسم کو قسم بالرب پر جو مقدم کیا گیا ہے تو اس میں اشارہ ہو سکتا ہے اس امر کی طرف کہ ((من عرّف نفسه فقد عرّف ربه)) کہ نفس بڑی چیز ہے یہ ہماری قسم کا مقسم بہ بننے کے قابل ہے تم اس کو پہچانو اگر اس کو پہچان لو گے تو ہم کو بھی پہچان لو گے چونکہ معرفت نفس وسیلہ ہے معرفت رب کا اس لئے نفس کی قسم کو مقدم کیا گیا جیسے مقدمہ ذکر میں مقدم ہوتا ہے گو مقصودیت میں موخر ہو اور یہ بھی نکتہ ہے کوئی علم مقصود نہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسئلہ تقدیر کو بیان کرنے کے بعد صراحۃً

یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت میں ہے پہلی حدیث میں یہ صراحت نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ آپ نے مسئلہ تقدیر کے بعد ایک آیت کی تلاوت کی تو وہاں اس بات پر کہ مسئلہ تقدیر کو اس آیت کے مضمون سے مناسبت حاصل ہے صرف قرینہ حالیہ تھا اور یہاں قرینہ مقالیہ موجود ہے مگر اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں بھی تقدیر کے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی اور خالق نفس کی قسم کھائی ہے اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ کہ خدا نے نفس کو پیدا کر کے اس کو خیر و شر کا الہام کیا یعنی انسان کے نفس میں نیکی اور بدی کی دو طاقتیں فطرۃً رکھ دی ہیں اس سے مسئلہ تقدیر کی تائید تصدیق کیونکر ہوئی؟

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھی وہی جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی علم اعتبار کے طور پر تشبیہ دی ہے کہ جس طرح فجور و تقوی کا القاء ہوا ہے اسی طرح اعمال کو مقدر بھی کر دیا ہے۔ پس بقول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان دو حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے بڑے شخص کے سر رکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں خود اتنی بڑی بات نہیں کہتا کیونکہ یہ بڑا دعویٰ ہے۔ اور اگر کوئی شخص شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو نہ مانے تو میں اس سے کہوں گا کہ پھر وہ ان حدیثوں کی شرح کر دے یقیناً ان حدیثوں اور آیتوں میں وہ کوئی وجہ ربط بجز اس کے جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بیان نہ کر سکے گا یہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علم وہبی ہے میں نے ان حدیثوں کا ایسا حل کسی کے کلام میں نہیں دیکھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے علم اعتبار کا استعمال

اب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے سے اس کو نقل کرتا ہوں وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اُن سے بھی علم اعتبار کا استعمال منقول ہے چنانچہ آیت: ﴿اَنْزَلَ مِنَ

السَّمَآءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ ۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾(۱) کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: (يُرِيْدُ بِالْمَاءِ الشَّرْعُ وَالدِّيْنُ وَبِالْاَوْدِيَةِ الْقُلُوْبُ) کہ یہاں سے شرع اور دین اور اودیہ سے (بطور تشبیہ کے) قلوب مراد ہیں صاحب روح المعانی نے اس کو نقل کر کے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تو صوفیاء کی تفسیر کے مثل ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسی تفسیر نہیں کر سکتے اس لئے یہ روایت غیر صحیح معلوم ہوتی ہے پھر بعد تسلیم صحت کے یہ توجیہ کی ہی (اِنَّمَا قَصَدَ اَنْ قَوْلَهٗ تَعَالٰى ﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ﴾ مَعْنَاهُ الْحَقَّ يَتَقَرَّرُ فِي الْقُلُوْبِ) اور میں نے مسائل السلوک میں یہ توجیہ کی ہے کہ (اِنْ صَحَّ ذٰلِكَ فَمَقْصُوْدُ الْخَبَرِ مِنْهُ الْاِشَارَةُ) اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے (لَيْنُ القلوب بَعْدَ مَوْتِهَا وَاِلَّا فَقَدْ عُلِمَ اَحْيَاءُ الْاَرْضِ مُشَاهَدَةً) یعنی یہاں ارض سے مراد مردہ قلوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو زندہ کر دیتے ہیں ورنہ زمین کا حال تو سب کو معلوم ہے (یعنی اس کی حالت بتلانے کا اتنا اہتمام ضروری نہ تھا) یہ بھی علم اعتبار ہی ہے اور (وَاِلَّا فَقَدْ عُلِمَ اِحْيَاءُ الْاَرْضِ مُشَاهَدَةً) سے تفسیر مشہور کی نفی کرنا مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے مخاطب تجھ کو اس آیت میں ظاہری مدلول پر اکتفا نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو ظاہری ہے بلکہ اس سے قلوب کی حالت کی طرف انتقال کرنا چاہئے کہ دلوں کی بھی وہی حالت ہے جو زمین کی حالت مشاہد ہے۔

اور یہ روایات میرے رسالہ مسائل السلوک میں مذکور ہیں ان آثار وغیرہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ علم اعتبار صوفیاء کی بدعت نہیں بلکہ نصوص میں اس کی اصل موجود ہے پس جو لوگ علم اعتبار کی رعایت کرنے میں صوفیاء پر زندقہ والحاد کا فتویٰ لگاتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں ہاں جو شخص اس کو قرآن کی تفسیر سمجھے اس کے زندقہ والحاد میں ہم کو بھی کلام نہیں۔

(۱) ''اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر نالے اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب خس و خاشاک بہالایا جو اس کے اوپر ہے'' سورۂ رعد: ۱۷(۲) ''یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے''۔ سورۂ حدید: ۱۷۔

علم اعتبار کی حقیقت کی توضیح

بہرحال علم اعتبار کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مشبہ کو دوسرے مشبہ بہ سے واضح کیا جائے ثابت نہ کیا جائے بلکہ مشبہ ثابت بدلیل آخر ہے۔ اور یہ نہ مجاز میں داخل ہے خواہ مجاز مرسل ہو خواہ استعارہ کیونکہ کنایہ میں موضوع لہ کے مراد نہ ہونے پر قرینہ ہوتا ہے اس لئے غیر موضوع لہ مراد ہوتا ہے اور یہاں نہ موضوع لہ کے غیر مراد ہونے کا کوئی قرینہ ہے نہ غیر موضوع لہ مراد ہے اور نہ یہ کنایہ میں داخل ہے کیونکہ کنایہ میں معنی موضوع لہ متروک نہیں ہوتے بلکہ کلام کا مدلول اصلی وہی موضوع لہ ہوتا ہے مگر مقصود اس کا لازم یا ملزوم ہوتا ہے جیسے (طَوِیْلُ النَّجَاد) کہ اس میں مدلول وضعی متروک نہیں مدلول کلام وہی ہے مگر مقصود طویل القامۃ ہے کیونکہ طویل النجاد کے لئے طویل القامۃ لازم ہے اور اعتبار میں وہ معنی نہ مقصود ہے نہ مدلول کلام ہے پس یہ اعتبار گویا قیاس تصرفی ہے اور مشابہ ہے قیاس فقہی کے مگر عین قیاس فقہی نہیں کیونکہ قیاس فقہی میں علت جامع مؤثر ہے حکم مقیس میں اس لئے وہ حکم منسوب الی القیاس ہوتا ہے یہاں یہ بھی نہیں صرف مقبس مقیس میں تشابہ ہے اور اس مشابہت کو حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ وہ حکم خود مستقل دلیل سے ثابت ہے یہ حقیقت ہے علم اعتبار کی پس صوفیاء تو اس کے حدود سے نہیں نکلتے کیونکہ وہ معانی منقولہ کے نہ مدلولیت کے منکر ہیں نہ مقصودیت کے اور جہلاء صوفیاء خود ان کے مدلولیت ہی کے منکر ہیں اور جدید تعلیم یافتہ مدلولیت کے تو منکر نہیں مگر مقصودیت کے قائل ہیں بلکہ مقصود معانی سیاسیہ ہی کو سمجھتے ہیں ان سب فرقوں کے سب فرقوں کو اچھی طرح سمجھ لو (۱)۔

(۱) اس پیراگراف میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے اصطلاحی الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو علماء سمجھتے ہیں یہ بحث ان کے لئے بہت مفید ہے عوام کی سمجھ میں اگر نہ آئے تو پریشان نہ ہوں ان کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ علم اعتبار بھی علم کی ایک قسم ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اخذ مضمون بطور علم اعتبار

اب سمجھئے کہ جس مضمون کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اس آیت کا نہ مدلول ہے نہ مقصود ہے بلکہ صرف اس کو اس کے مدلول سے مشابہت حاصل ہے پس یہ بیان اس آیت کے تحت میں بطور علم اعتبار کے ہوگا وہ مضمون یہ ہے کہ آپ کو آیت کے ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر خلق ازواج میں بہت سی آیات و دلائل قدرت کا ہونا بیان فرمایا ہے تو میں کہتا ہوں کہ علاوہ ان دلائل و آیات کے جو مدلول ظاہری ہیں اس تعلق ازواج میں ایک اور بات بھی ہے جس سے ہم کو سبق لینا چاہئے۔

معاملہ نکاح تعلق مع اللہ کی نظیر ہے

نکاح کا معاملہ ایسا ہے کہ اسمیں غور کرنے سے آنکھیں کھلتی ہیں اور سالک کو سبق ملتا ہے کہ یہ تعلق نکاح کے معاملات تعلق مع اللہ کی بعض معاملات کی نظائر ہیں تو گویا معاملات نکاح میں ان معاملات پر بھی ایک طرح کی آیات ہیں کیونکہ نکاح کے اندر تین درجے ہوتے ہیں(۱)۔ ایک درجہ عدم تعلق کا ہے کہ ابھی تک نکاح کا پیغام بھی نہیں دیا گیا بلکہ ذہن خالی ہے ایک (دوسرا) درجہ خطبہ کا ہے کہ پیغام دیا گیا اس درجہ میں قدرے تعلق ہوجاتا ہے (اس کے بعد ایک تیسرا درجہ ہے کہ پیغام دینے کے بعد پیغام منظور ہوگیا اور رشتہ قرار پا گیا اس درجہ میں پہلے سے زیادہ تعلق ہوجاتا ہے اور آپس میں لین دین آمد و رفت ہدایا تحائف کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے ۱۲ظ) ایک (چوتھا) درجہ اس کے بعد ہے جس کا نام نکاح ہوجانا اور وصول ہوجانا ہے یہ تو ظاہر ہے۔ اب سمجھئے کہ یہی حال سلوک اور تعلق مع اللہ کا ہے کہ وہاں

(۱) بلکہ چار درجے ہوتے ہیں ۱۲ظفر احمد۔

بھی تین درجات ہیں(۱) ایک درجہ بے تعلقی کا ہے بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ کی طلب نہیں گو علم ہے تو یہ تو ایسا ہے جیسا ہم کو یہ علم ہے کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی ہے سو ظاہر ہے کہ اس علم کا نام تعلق نہیں بلکہ تعلق طلب اور خِطبہ سے شروع ہوتا ہے اسی طرح یہاں سمجھو کہ علم و معرفت قبل از طلب کو تعلق مع اللہ نہیں کہا جاسکتا اس کے بعد ایک درجہ یہ ہے کہ طلب پیدا ہوگئی اور کسی بزرگ سے درخواست کی گئی کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کے ملنے کا راستہ بتلاؤ اور اُس نے راستہ بتلانا شروع کردیا اور یہ راستہ پر چلنے لگا پھر کوئی ابتدا میں ہے کوئی وسط میں ہے یہ مشابہ خِطبہ کے ہے (مگر ابھی تک اس کو یہ نہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی مجھ سے تعلق ہے یا نہیں اس کے بعد ایک درجہ یہ ہے کہ ادھر سے بھی اس کے ساتھ تعلق کا اظہار ہونے لگا اور رضا کے آثار و معاملات اس کے ساتھ ظاہر ہونے لگے یہ وہ درجہ ہے جو منظوری خِطبہ کے بعد ہوتا ہے ۱۲ اظ) اس کے بعد ایک درجہ وصول کا ہے کہ نسبت مع اللہ عطا ہوگئی اور یہ شخص واصل بحق ہوگیا۔

شبہ کا جواب

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا ہی نہیں جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت در گا ہیست ہر چہ بروئے میرسی بروئے مالیست (۲)

اور ایک عارف کہتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می بالد نجود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا(۳)

اور جب اس کی انتہا کہیں نہیں پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصل تو محدود تک ہوسکتا ہے غیر محدود تک وصول کہاں ہوسکتا ہے اور یہی وہ مضمون ہے جو پہلے وعظ میں بیان سے رہ گیا تھا۔ کیونکہ میں نے پہلے وعظ میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ شریعت

(۱) بلکہ چار درجات ہیں ۱۲ ظفر احمد (۲) اے بھائی! یہ ایسی درگاہ ہے جس کی کوئی حد نہیں جس منزل پر پہنچو گے اس سے آگے پھر منزل ہے (۳) عشق کی راہ طے کرنے سے کبھی طے نہیں ہوتی خود کو اس راہ میں ڈال دو۔

میں ہر شے کے لئے ایک حد ہے اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ کی تو حسب تصریح صوفیاء کوئی حد نہیں بلکہ یہ تعلق غیر متناہی ہے۔

وصول کے معنی اور تعلق مع اللہ کے درجات

سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ یہ غیر محدود ہے سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہوگئی اور ذکر و شغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہوگیا یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جان گئے موانع مرتفع کردیئے معالجہ امراض سے واقف ہوگئے نفس کی اصلاح ہوگئی اخلاق رذیلہ زائل ہوگئے اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہوگیا اعمال صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بن گئی اعمال وعبادات میں سہولت ہوگئی نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوگیا تو سیر الی اللہ ختم ہوگئی اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا تعلق سابق میں ترقی ہوئی اسرار وحالت کا ورود ہونے لگا یہ غیر محدود ہے یہی وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بحر یست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز انیکہ جاں بسپارند چارہ نیست (۱)

سیر فی اللہ کے غیر محدود ہونے کی مثال

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہاں تک کہ پاس ہوگیا اور سند مل گئی تو اس وقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہو نئی نئی باتیں منکشف ہوں اس کی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود

(۱) عشق کا سمندر ایسا ہے کہ اس کا کنارہ ہی نہیں ہے یہاں جان دیدینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

ہے جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔

دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہوگیا ہو اور وہ حرکت اینیہ کر کے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی المرکز ختم ہوئی پھر اس کے بعد اپنے مرکز پر پہنچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں اسی طرح یہاں سمجھو پس وہ شبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی سو میں نے بتلادیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دی جاتی اور سالک کو مجاز بنایا جاتا ہے جیسا علوم ظاہرہ میں ایک نصاب خاص کے ختم کرنے اور پاس کر لینے پر سند دی جاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے اور ایک درجہ غیر محدود ہے اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود بھی صحیح ہے۔ (اور اسی کے مشابہ ایک سوال اور ہے کہ جب ہر شے محدود ہے تو کیا ایمان بھی محدود ہے کہ جواب یہ ہے کہ ایمان کے حدود و قیود یہ ہیں کہ ذات کی کنہ کی تفتیش اور اس میں فکر نہ کرے ظنّیات کو مدار اعتقاد نہ رکھے وغیر ذلک یہ سوال و جواب نظر ثانی میں زائد کیا گیا) یہ تو ایک شبہ کا جواب تھا۔

معاملہ نکاح سے حاصل شدہ سبق

اب میں کہتا ہوں کہ معاملہ نکاح سے ہم کو چند سبق لینا چاہئیے کہ یہ دنیا میں نظیر ہے تعلق مع اللہ کی اول یہ سبق ہو کہ جب تم ایک عورت کی طلب سے مستغنی نہیں ہو تو خدا کی طلب سے کیونکر مستغنی ہو گئے۔

ایکہ صبرت نیست از فرزندوں صبر چوں داری زرب ذوالمنن

ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری زنعم الماہدون (۱)

(۱) اے بھائی تم اولاد کے نہ ہونے پر تو صبر کر نہیں سکتے تو اللہ رب العزت کی ملاقات سے کیسے صبر کر سکو گے۔ اے بھائی جب تم دنیا و ذلیل کے حاصل نہ ہونے پر صبر نہیں کر سکتے تو پھر جنت کی نعمتوں سے کیسے صبر کر سکو گے۔

پھر جب کوئی شخص کسی عورت کو پیغام دیتا ہے تو اس وقت یہ سوچے کہ اک عورت کی طلب کے لئے اس کو پیغام دینے میں کتنی کتنی باتوں کی رعایت کرنا پڑتی اور اسکی تلاش میں کیسی کیسی دقتیں اُٹھانا پڑتی ہیں کہ بقول عورتوں کے جوتیاں بھی گھس جاتی ہیں خط پر خط اور قاصد پر قاصد بھیجے جاتے ہیں اور لڑکی والا ہے کہ اشارہ کنایہ ہی کرتا رہتا ہے صاف طور سے تسلی نہیں کرتا پس حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق حاصل کرنے کا جن مشائخ کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اگر وہ ایک دو دفعہ ٹالیں اور درخواست کے ساتھ ہی تم کو بیعت نہ کریں تو اس کا بھی تحمل کرنا چاہئے پھر خطبہ منظور ہوجاتا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ ہدایا وتحائف سے اس کے اہل وخاندان کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی نامرضی سے پوری طرح بچتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ ہماری حالت کو دیکھ کر پیغام چھوڑ الیں تو ایسے ہی طلب حق کے بعد سالک کو رضائے حق میں سعی اور نامرضیات سے بچنے کا اہتمام بلیغ کرنا چاہئے پھر ایک اور بات بھی جو اس مجمع میں بیان کرنے کی نہ تھی مگر چونکہ مشہور ہے اس لئے بیان کرتا ہوں کہ جس لڑکی کو پیغام دیا جاتا ہے گو ابھی نکاح نہ ہوا ہو صرف پیغام ہی سے اُس کو بھی اس شخص سے گونہ تعلق ہوجاتا ہے جس کے لئے اس کو پیغام دیا ہے ہم نے بعض واقعات ایسے سنے ہیں کہ پیغام چھٹنے پر جیسے لڑکے کو رنج ہوا لڑکی کو بھی رنج ہوا۔ خیر یہاں تو یہ بات اکثر ہی ہے جس میں لزوم نہیں۔

سالک کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ بھی اس کو چاہتے ہیں اور اس کی دلیل

مگر طلب حق میں تو لزوما عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب کوئی ان کی طلب کرتا ہے تو وہ بھی اس کی طلب کرتے ہیں یعنی وہ بھی اس کے حال پر متوجہ ہوجاتے ہیں احادیث میں مصرح ہے ((مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا))(۱) پس

(۱) جب کوئی میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک گز بڑھتا ہوں۔

سالک کو طلب میں سرگرم ہونے کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے وہ بھی مجھ کو چاہتے ہیں یہ مراقبہ مفید ہوگا اس سے محبت بڑھے گی ورنہ افسردہ ہوجائیگا مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تابجوشد آیت از بالا پست (۱)

تشنگان گر آپ جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگان (۲)

یعنی محبوب کو تم سے تعلق ضرور ہے اگر ان کو تعلق نہ ہوتا تو تم کو طلب ہی نصیب نہ ہوتی

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کہ بہ نسبت ہستت ہم ایں وہم آں (۳)

مگر فرق اتنا ہے کہ ؎

عشق معشوقان نہان ست عشقِ عاشق بادوصد طبل و نفیر (۴)

شہر بھر میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے اور محبوب کا تعلق مخفی ہے مگر ہے تعلق دونوں طرف جیسا مشہور ہے

ع عشق اول دردل معشوق پیدامی شود (۵)

عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

عاشق کہ شد کہ یار بجانش نظر نکرد اے خواجہ دردنیست وگرنہ طبیب ہست

یہ انہی کی محبت کا اثر ہے کہ تم بدون دیکھے ہوئے ان کے طالب ہوتم نے تو ان کو دیکھا بھی نہیں انہوں نے ہی تم کو اپنی محبت وطلب میں لگایا ہے یہ بڑی دلیل ہے ان کی محبت کی پس یہ تصور کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے ؎

جوشش عشق ست کاندرمے افتاد آتش عشق ست کاندر نے فتاد

کرد جودے نالۂ نے را اثر نے جہاں را پرنکردے از شکر (۶)

---

(۱) پانی اگر کم ہے تو پیاس کو بڑھاؤ تاکہ پانی میں جوش آئے اور وہ نیچے سے اوپر آجائے (۲) پیاسے اگر پانی کی تلاش میں ہیں تو پانی بھی پیاسوں کی تلاش میں ہے (۳) جس نے عاشق کی حالت دیکھی ہے معشوق کو بھی دیکھے کہ اسی نسبت سے اس کو بھی تعلق ہوگا (۴) مگر اتنا فرق ہے کہ معشوق کا عشق پوشیدہ ہے اور عاشق کا عشق تشت از بام ہے (۵) عشق اول معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے (۶) عشق کا جوش شراب میں ہے اور عشق کی آگ بانسری میں ہے سخاوت فیاضی بانسری میں اثر انداز ہوتی لیکن صرف بانسری کی آواز جہاں میں مٹھاس کو نہیں پھیلاتی۔

یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور تعلق کے آثار تمہارے اندر جو ہیں گو وہ خود مخفی ہیں مگر طلب کے ساتھ جو معاملات ہوتے ہیں جن کو طالب خود جانتے ہیں وہ معاملات و آثار بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ان سے تعلق ہے اور اسی لئے تو ان کی شان الظاھر والباطن ہے یعنی ذات سے باطن ہیں اور آثار سے ظاہر ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق من پیداد معشوقم نہاں یار پنہاں فتنۂ اودر جہاں (۱)

تعلق مع اللہ اور نکاح میں ایک اور مشابہت

ایک مشابہت تعلق نکاح اور تعلق مع اللہ میں یہ ہے کہ نکاح میں جب تک وصول نہیں ہوتا مشاطہ ودلالہ (۲) کی احتیاج ہے بعد حصول مقصود مشاطہ ودلالہ کا دخل نہیں رہتا اسی طرح سلوک میں بعد انتہا شیخ کی حاجت نہیں رہتی اس وقت اس کا معاملہ براہ راست حضرت حق سے ہوتا ہے شیخ کی احتیاج نہیں رہتی بلکہ وہ خود مجتہد ہوجاتا ہے اس طرح خالص مجاہدات بھی حذف ہوجاتے ہیں اسی کو فرمایا ہے:

خلوت و چلہ برولازم نماند (۳)

اور فرمایا ہے ؎

جلوہ بیند شاہ وغیر شاہ نیز وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز (۴)

البتہ شیخ کا شکر اس وقت بھی واجب ہوتا ہے اعراض یا اعتراض یا انکار سے مردود ومسلوب النسبت ہوجاتا ہے نکاح کے متعلق ایک تو یہ مضمون تھا جس کا بیان کرنا مجھے مقصود تھا کہ یہ تعلق نظیر ہے تعلق مع اللہ کی۔

---

(۱) میرا عشق ظاہر ہے اور معشوق پوشیدہ میرا محبوب پوشیدہ لیکن اس کی رعنائیاں سارے جہاں میں پھیلی ہوئی ہیں (۲) پیغام رسانی کرنے والے کی ضرورت ہے (۳) خلوت اور چلہ کشی اس پر لازم نہیں رہتے (۴) خدا کا جلوہ دیکھتا ہے شاہ ہو یا غیر شاہ خلوت میں اللہ کے جلوے کے علاوہ کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

لڑکی پر نکاح کا اثر، تعلق مع اللہ میں اس سے سبق لینا چاہیے

ایک اور اثر نکاح کا ہے جس کو استطراداً بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ابتک تو ان آثار سے سبق دیا گیا تھا جو مرد پر نکاح کے معاملہ میں ظاہر ہوتے ہیں اب نکاح کا ایک اور اثر خوف لڑکی پر ہوتا ہے وہ یہ کہ نکاح سے پہلے تو لڑکی کا گھر وہ تھا جو اس کے ماں باپ کا گھر تھا اور اس کے دوست وہ لوگ تھے جو ماں باپ کے دوست تھے اور دشمن وہ تھے جو اس کے ماں باپ کے دشمن تھے مگر نکاح ہو جانے کے بعد ہی سے وہ کم عمر لڑکی جس کو دنیا کی ہوا بھی نہیں لگی آج ہی سے اپنی زندگی میں ایسا انقلاب عظیم کر لیتی ہے کہ آج سے اسکا گھر وہ ہے جو شوہر کا گھر ہے اور اس کا دوست وہ ہے جو شوہر کا دوست ہے اور دشمن وہ ہے جو اس کے شوہر کا دشمن ہے یہاں تک کہ اگر کبھی خدانخواستہ اس کے باپ اور شوہر میں جھگڑا ہو جائے تو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی اپنے باپ کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اُس کا گوشۂ خاطر اس وقت بھی شوہر کی طرف ہوتا ہے۔ صاحبو! ایک کم عمر لڑکی اپنے شوہر کے تعلق کا یہ حق ادا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے ایسا انقلاب اپنی زندگی میں کر دیتی ہے افسوس آپ مرد ہو کر خدا کے تعلق کا اتنا حق بھی ادا نہیں کرتے کہ خدا سے تعلق رکھنے والوں کو یگانہ و آشنا سمجھو اور جو اس سے بے تعلق ہو اس کو بیگانہ و نا آشنا سمجھو۔ خدا کے دوستوں کو اپنا دوست اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھو افسوس آپ اس کم سن لڑکی سے بھی گئے گذرے۔

صاحبو! محبت کا یہ بہت بڑا حق ہے اس کو ادا کرو آج کل اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے بس آپ کی تو یہ شان ہونی چاہیئے ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　فدائے ایک تن بیگانہ کاشنا باشد[۱]

(۱) ہزار اپنے وہ افراد جو خدا سے بیزار ہیں ایک بیگانہ (شیطان) پر فدا ہیں جس کو اپنا آشنا بنایا۔

تعلق مع اللہ کی ایک اور نظیر

تعلق نکاح کا ایک اور اثر سنئے اور اس سے بھی سبق لیجئے کیونکہ واقعی یہ تعلق ایسا پاکیزہ ہے کہ دنیا میں یہ تعلق مع اللہ کی نظیر ہے وہ اثر یہ ہے کہ میاں بیوی میں چاہے کیسی ہی لڑائی ہوجائے مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر پوری صفائی ہوجاتی ہے اور ایسی صفائی ہوتی ہے کہ پہلے رنج کا مطلق کوئی اثر باقی نہیں رہتا اس سے یہ سبق لیجئے کہ جب ایک تنگ ظرف کی یہ حالت ہے کہ محبت و تعلق کے بعد اگر کچھ اس کو ناگواری پیش آجائے تو ذرا سی دیر میں اس کو دل سے نکال دیتی اور دل کو صاف کرلیتی ہے کہ ذرا سا بھی اس کے دل میں کینہ نہیں رہتا بلکہ مثل سابق بدستور شوہر کی خیر خواہ جان نثار ہوجاتی ہے تو کیا نعوذ باللہ اگر آپ سے تعلق مع اللہ کے بعد کوئی گناہ یا خطا سرزد ہوگی تو بعد توبہ استغفار کے وہ تعلق کو بحال نہ کرینگے اور نعوذ باللہ تم سے کینہ رکھیں گے۔ حالانکہ وہ غیر متاثر ہیں کہ کسی کی نافرمانی و مخالفت سے ان کو بے اختیار ہوکر غصہ نہیں آتا بلکہ ان کا غضب و رحم سب اختیاری ہے پھر ان کی شان ہے یہ((سبقت رحمتی علی غضبی)) کہ رحمت غصہ پر غالب ہے تو کیا تم نے خدا کو نعوذ باللہ کم حوصلہ سمجھ لیا ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں؛ پس اس کا تصور کیا کرو کہ جیسے میاں بیوی میں شکر رنجی کے بعد بہت جلد صفائی ہوجاتی ہے یوں ہی حق تعالیٰ سے تعلق کے بعد اگر کچھ کوتاہی ہوجائے تو بعد توبہ و معذرت کے وہ تعلق کو ویسا ہی بحال کردینگے اس کو سوچ کر دیکھو بہت نفع ہوگا۔

مرد بیوی کی باتوں کا بہت تحمل کرتا ہے اس سے بھی سبق لینا چاہئے

میاں بیوی کے تعلقات میں ایک بات یہ ہے کہ بعض دفعہ میاں کو بیوی کی جہالت و نادانی سے تکلیف بھی ہوتی ہے تو وہ تحمل کرتا ہے خاص کر بیوی محبوبہ بھی ہو تو اس کے ہر امتحان پر تحمل کیا جاتا اور اس کے ناز و نخروں کو برداشت کیا جاتا ہے

پھر یہ کیا غضب ہے کہ حق تعالیٰ کے امتحانات کا تحمل نہ کیا جائے کہ اگر کبھی وہ بیمار کردیں یا مال کا نقصان کردیں یا کسی عزیز کو موت دیدیں تو اس پر ناگواری ظاہر کی جاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ظاہری تکلیف بھی نہ ہو اور طبعی رنج بھی نہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ عقلاء کو رنج و شکایت نہ ہونی چاہئے بلکہ عقلاء کو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ویسا ہی راضی اور خوش رہنا چاہئے جیسا انعامات اور راحت کے وقت خوش رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

تو بیک زخمے گریزانی زعشق تو بخبر نامے چہ میدانی زعشق (۱)

حکایت

مولانا نے اس مقام پر ایک شخص کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک دلاک یعنی گودنے والے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنادے اُس نے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اس نے ایک آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو؟ کہا دم بناتا ہوں' کہنے لگا دم کو رہنے دو یہ لنڈورا (۲) ہی سہی اُس نے دوسری جگہ سوئی چبھوئی اُس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو؟ کہا کان بنارہا ہوں' کہنے لگا کان بھی رہنے دو یہ بوچا (۳) ہی سہی۔ اُس نے تیسری جگہ سوئی لگائی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا کر رہے ہو؟ کہا پیٹ بناتا ہوں کہنے لگا اس کو بھی رہنے دو اس شیر کو کھانا پینا تھوڑا ہی پڑے گا یہ بدون پیٹ ہی کے سہی۔ اُس نے چوتھی جگہ سوئی ماری اس نے آہ کرکے پھر پوچھا اب کیا بناتے ہو؟ کہا سر بناتا ہوں کہنے لگا سر بھی رہنے دو یہ بے سر ہی سہی دلاک نے جھلا کر سوئی پھینک دی اور کہا ؎

شیر بے گوش و سد اشکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

کہ بیوقوف! ایسا شیر بھی کسی نے دیکھا ہے جس کے نہ سر ہو نہ پیٹ ہو ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا مولانا اس پر فرماتے ہیں ؎

(۱) تو صرف ایک زخم لگنے پر ہی عشق سے گریز کرنے لگا۔ تو نے صرف عشق کا نام سنا ہے اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے (۲) بغیر دم کا ہی ٹھیک ہے (۳) بغیر کانوں کا۔

چوں نداری طاقت سوزن زون　　بس توزا شیرژیاں ہم دم مزن(۱)

کہ جب تم کو ایک سوئی کی برداشت نہیں تو شیر کی تصویر کے طالب کیوں بنتے ہو۔

چوں بیک زخمے گریزانی زعشق　　تو بخسپ تا مے چہ میدانی زعشق(۲)

جیسا تم ایک ہی چرکہ میں عشق کو خیر آباد کہنے لگے تو بس تم کو عشق کا نرا دعویٰ میں دعوی ہے عشق کی تم کو ہوا بھی نہیں لگی

خلاصۂ وعظ

جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا تھا بیان کر چکا اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں، خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت نکاح کے آثار آپ کو اس لئے یاد دلائے ہیں تا کہ آپ کو معلوم ہوجائے کہ تعلق مع اللہ کی ایک نظیر دنیوی تعلقات میں موجود ہے پس آپ کو اللہ تعالیٰ کی طلب کم از کم اس طرح تو کرنا چاہئے جس طرح نکاح میں بیوی کی طلب کرتے ہو اور اس کے آثار سے تعلق مع اللہ میں سبق حاصل کرنا چاہئے پس یہ بڑی آیت اور نشانی ہے جو تعلق نکاح میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے موجود ہے۔

نکاح کا تکوینی راز

اس کے بعد میں ایک تکوینی راز نکاح کا بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بندہ کا کمال یہ ہے کہ وہ مظہر اتم حق تعالیٰ کا بن جائے سو بدون نکاح کے یہ مظہریت اتم نہیں ہوتی کیونکہ حق تعالیٰ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ ﴿اِذَا اَرَادَ شَیْئًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾ کہ وہ جب کسی چیز کو بنانا چاہتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں ہوجا تو وہ فوراً پیدا ہوجاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ بدون احتیاج اسباب کے محض ارادہ ہی سے جس چیز کو

(۱) اگر جسم میں ایک سوئی چبھنے کی برداشت بھی نہیں ہے تو پھر جسم پر شیر بنوانے کی خواہش نہ کر (۲) جبکہ تم ایک زخم برداشت نہیں کر سکے تو میدان عشق کیسے چل سکو گے۔

چاہتے ہیں پیدا کر دیتے ہیں اور اس شان کا ظہور بندہ میں نکاح ہی سے ہوتا ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے میں بندہ بھی زیادہ اسباب کے اہتمام کا محتاج نہیں بے مشقت ایک فعل کیا اور اگر کوئی عارض نہ ہوا حمل رہ گیا اور بچہ بن گیا۔ کہ واقع میں یہاں بھی اسباب ہوتے ہیں مگر وہ اسباب ایسے نہیں ہیں جن کی تلاش اور فکر کی ضرورت ہو بس اب میں ختم کر چکا۔

انتخابِ مضمون کی وجہ

چونکہ اس وقت یہ اجتماع ایک نکاح کی تقریب میں ہوا ہے اس لئے اس تقریب کے سلسلہ میں نکاح ہی کے آثار سے میں نے یہ مضمون اخذ کیا تا کہ لوگوں کو اس سے سلوک اور تعلق مع اللہ میں سبق ملے اور یہ تقریب محض دنیوی تقریب نہ رہی بلکہ جب اس سے سبق دین کا لیا جائیگا تو یہ دینی تقریب بن جائیگی۔ اگر میں اس مضمون کے متعلق یہ بھی کہوں کہ میں نے اس پر اس آیت میں جو لفظ آیت ہے اس کے عموم سے استدلال کیا ہے تو کہہ سکتا ہوں مگر میں حد ظاہری سے بھی تجاوز نہیں کرتا میں صاف کہتا ہوں کہ فی ذلك لآيات سے نکاح کے اندر جن دلائل کا وجود بتلایا گیا ہے یہ مضمون اس میں صراحۃً داخل نہیں بلکہ میں نے اس کو صرف علم اعتبار کے طور پر بیان کیا ہے۔

خاتمہ اور دعا

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں (۱)

وصلی اللّٰہ علی خیر خلقه سیّدنا ومولانا محمّد وعلی اٰلِهٖ واصحابه اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العٰلمین

(۱) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اس دعا کا مصداق بنادے آمین

خلیل احمد تھانوی ۱۶ ذی الحجہ ۱۴۲۹